قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

کراچی : ہفتہ ۔ ۷ ۔ مئی ۱۹۵۵ء

جلد ۸
شمارہ ۱۴

قرآن نے کیا کہا؟

سورہ یوسف کی یہ آیت ہمارے سامنے آجکل ہے وما یومن اکثر ھم باللہ الا وھم مشرکون (۱۲/۱۰۶) ۔ ان میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ ایمان کے دعویدار ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں ۔ آئیے دیکھیں کہ ایسے لوگ کون ہیں جو مسلمان ہونے کے دعوے کے باوجود قرآن کی رو سے مشرک رہتے ہیں ۔ سورہ روم میں ہے ۔ ولا تکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً ۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۱) دیکھنا! تم نے کہیں مشرکین میں سے نہ ہوجانا ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کرلئے اور خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے ۔ پھر ہر فرقہ خوش ہے کہ جس مسلک پر وہ ہے حق و صداقت کا مسلک ہے (اور باقی سب غلطی پر ہیں) ۔

لہذہ قران کی رو سے دین میں فرقے پیدا کرلینا شرک ہے ۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

۱ تنہا عقلِ انسانی اعمالِ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں ۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو خارجی روشنی کی ۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے ۔ اس لئے نوعِ انسانی کو قرآن کے غیر تبدیل مستقل اصولوں کی ضرورت رہتی ہے ۔

۳ حق و باطل کا معیار قرآن ہے ۔ ہر وہ بات جو قرآن کے خلاف ہو گی وہ یقیناً غلط ہے ۔

۴ حضور نبی اکرم کی سیرت مقدسہ ... [illegible] ... حضور کی سیرت کا حقیقی اور واحد ماخذ قرآن کریم ہے ۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بہترین نظام انسانی ... [illegible] ... کے نظام زندگی بسر کرے ۔

۶ اس نظام کے تحت اسلامی زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ... [illegible] ... تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ... [illegible] ... قوانین خود مرتب کریں ... [illegible] ... سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے ۔

۷ اس نظام کا مقصد ... [illegible] ... معاشرے کی تشکیل کرنا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا ۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

۸ ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہوتی رہے ۔ ... [illegible] ... محتاج نہ رہے ۔ اسے قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے ۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

... [illegible] ... پاکستان میں ... [illegible] ... قرآنی نظام ربوبیت متشکل ہو جائے ... [illegible] ... صفات خداوندی کی روشنی میں ... [illegible] ... صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں ... [illegible] ...

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ نظام ربوبیت ★ معاشی ناہمواریاں ★ پی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی ★ نمائش ★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت ★ مجلس اقبال ★ ابن جریر طبری ★ سنت کی صحیح حیثیت ★ بزم طلوع اسلام
★ نقد و نظر ★ باب المراسلات ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ

تازہ پیشکش

٭ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ہفتہ وار

جلد ۸ | ۷ مئی ۱۹۵۵ء | نمبر ۱۴

نظامِ ربوبیت

(تسلسل اشتراکیت اور اسلام)

سابقہ اشاعت میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ کمیونزم کس طرح نوعِ انسانی کے لئے تباہی کا موجب اور اسلام کے مدِ مقابل ایک بے خدا دینی تحریک ہے۔ اور اس کے پیش کردہ تصورِ حیات کی رو سے کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ کمیونزم نے انسانیت سوز مادی تصورِ حیات کو کس طرح حق کے نقاب میں چھپا کر پیش کیا ہے۔ یہ حق کا نقاب وہ معاشی نظام ہے جسے وہ سرمایہ پرستی کے نظام کے مقابلہ میں سامنے لاتے ہیں۔ اس نظام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ جمہور کی اجتماعی اور مشترکہ تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ ان سے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ اشتراکیت کے اس نگاہ فریب نقاب نے جہاں ایک طرف یہ نقصان پہنچایا ہے کہ یہ مادی نظریۂ حیات کی اس طرح پردہ پوشی کر دیتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کے جوش میں وہ کس تباہی کے جہنم کی طرف بہے جا رہا ہے۔ دوسری طرف اس نے یہ صورت بھی پیدا کر دی ہے کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کی مذمت اور غریبوں اور محنت کشوں کی حمایت میں کچھ کہا، مفاد پرست گروہ نے فوراً کہنا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ خصوصیت صرف کمیونزم کو حاصل ہے کہ وہ نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت کرے۔ کمیونزم کے علاوہ ہر نظامِ زندگی اور تصورِ حیات، سرمایہ داری کے حق میں ہے۔ حتیٰ کہ اسلام بھی سرمایہ داری کے نظام کا مؤید ہے۔ ان حضرات کی یہ روش خود کمیونزم کو اس قدر تقویت پہنچا رہی ہے کہ مسلمان نوجوان کشاں کشاں اس کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نظامِ سرمایہ داری کی ہلاکت خیزیاں اس قدر نمایاں ہو چکی ہیں کہ بجز ان لوگوں کے جن کی ذاتی مفاد پرستیاں انہیں اس سے وابستہ رکھنے پر مجبور کر رہی ہوں، کوئی صاحبِ قلبِ سلیم اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ نوجوان طبقہ سنتا ہے کہ اسلام سرمایہ داری کے نظام کی مخالفت نہیں کرتا تو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں پاتا کہ وہ کمیونزم کے آغوش میں جا کر پناہ لے۔

اب کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک اور روش چل پڑی ہے اس کا نام ہے اسلامک سوشلزم۔ اس اصطلاح کے استعمال کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نظری طور پر نظامِ سرمایہ داری کی پوری پوری مخالفت کرتے جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی کمیونزم کو بھی اسلام کے نقیض قرار دیں گے۔ اس کے بعد بڑے فخر اور طمطراق سے کہیں گے کہ اسلام خود ایک سوشلزم کا نظام ہے۔ جس میں نہ نظامِ سرمایہ پرستی کی تباہ کاریاں ہیں اور نہ ہی کمیونزم کی انسانیت سوز گمراہیاں۔ یہ ان دونوں سے الگ، اپنا معاشی نظام رکھتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی مشکلات کا نہایت معقول حل پیش کرتا ہے۔ اس تمام دھواں دار تقریر اور خطیبانہ تحریر کے بعد جب آپ ان سے پوچھئے کہ اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے۔ ذرا اس کی تفاصیل بتائیے۔ تو آپ حیران ہوں گے کہ ان کے ذہن میں صدقہ و خیرات اور اڑھائی فیصدی زکوٰۃ سے آگے کچھ نہیں ہوگا۔ اور جب آپ ان سے کہیں کہ جناب! اس سے نوعِ انسانی کی اقتصادی مشکلات کا حل کس طرح سے ہو جائے گا، تو اس کے جواب میں وہ جھٹ سے کہہ دیں گے کہ یہ کمیونسٹ ہے۔

یہ ہے وہ صورتِ حالات جس سے ہماری قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سخت پریشان ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کدھر جائے۔ ہمارا دور، معاشی دور (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ اس میں معاشیات نے اتنی اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ ویسے بھی معیشت، انسان کی حیاتِ ارضی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کے متعلق صحیح پوزیشن کا سامنے آنا نہایت ضروری ہے۔ پاکستان میں اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا کہ یہ اسلامی اندازِ نظامِ زندگی کی تجربہ گاہ بنے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، قائدِ اعظم مرحوم نے اپنی زندگی کی آخری تقریر میں (جو انہوں نے اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں کی تھی) فرمایا تھا:

"مغرب کے اقتصادی نظام نے نوعِ انسانی کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا حل بمشکل مل سکتا ہے اور ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ نظر آتا ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کو جس تباہی کا سامنا ہے اس سے اسے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ یہ نظام اس باب میں سخت ناکام رہا ہے کہ مختلف افراد میں عدل کیا جا سکے اور اقوامِ عالم میں باہمی تصادم نہ پیدا ہو۔ اس کے برعکس، گذشتہ پچاس سال میں جو دو مہیب عالمگیر لڑائیاں ہوئی ہیں اس کی بیشتر ذمہ داری اس نظام پر عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اقوامِ مغرب، اپنی مشینی اور صنعتی ترقیوں کے باوجود، جس پریشان حالی میں ماخوذ ہیں اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس اہم فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغامِ امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا اور نوعِ انسانی کی بہبود، مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

قائدِ اعظم مرحوم کی عمر نے ایفا نہ کی اس لئے انہیں یہ بتانے کی بھی فرصت نہ مل سکی کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے اور اس "عدلِ عمرانی" کی تفصیل کیا ہے جس کی طرف انہوں نے اجمالاً اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں پاکستان کے اربابِ حل و عقد بھی عدمِ تعین کے اس دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں تشکیلِ پاکستان کے وقت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دستورِ پاکستان کی سفارشات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مملکت کا اقتصادی نظام پچیس سال تک "کتاب و سنت" کے دائرہ سے باہر رہے گا۔ اس لئے کہ نہ خود انہیں معلوم تھا کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہوگا اور نہ ہی اسے اربابِ شریعت متعین کر کے دے سکے تھے۔

طلوعِ اسلام کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ دیکھے اور بتائے کہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کے متعلق قرآن کریم کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے اس سوال کو بھی اپنی فکر و تحقیق کا موضوع بنایا کہ قرآن کی رو سے نوعِ انسانی کا اقتصادی نظام کیسا ہونا چاہیئے۔ اس باب میں اس کی قرآنی بصیرت اسے جن نتائج تک پہنچا سکی ان کا ذکر مختلف

اوقات میں نجماً نجماً کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب اس پوری فکر کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، جس کا نام ہے نظامِ ربوبیت۔ طلوعِ اسلام، محترم پرویز صاحب کی اس کوشش کو، اس درخواست اور آرزو کے ساتھ بحضورِ ملت پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہے کہ وہ اس پر نہایت سکون اور اطمینان سے غور کرے۔ اور اگر سمجھے کہ اس میں قرآن کے اقتصادی نظام کو صحیح طور پر پیش کیا گیا ہے تو پھر سوچے کہ اس نظام کو عملاً کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ نظامِ ربوبیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کے اقتصادی نظام میں مملکت اس کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے رزق کے سرچشمے (وسائلِ پیداوار) افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے ملت کی اجتماعی تحویل میں بطورِ امانت رہتے ہیں، اس لئے مفاد پرست حلقوں کی طرف سے یہ شور اٹھایا جائے گا کہ کمیونزم کی تبلیغ ہے (چنانچہ ربوہ والوں نے تو ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ طلوعِ اسلام کا تعلق روس کے ساتھ ہے اور یہی کچھ جماعتِ اسلامی والوں کی طرف سے مشہور کیا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب پنجاب میں زرعی زمینوں کی ملکیت کا سوال زیرِ غور تھا تو مرزا بشیر الدین محمود صاحب اور سید ابوالاعلیٰ صاحب، دونوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کتابیں لکھی تھیں کہ زمین پر بلا حدود انفرادی ملکیت عین اسلامی شریعت کے مطابق ہے۔ اور قانون کی رُو سے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینداریاں ختم یا کم کر دینا مداخلت فی الدین ہے) ہم طلوعِ اسلام میں بہ تکرار لکھتے چلے آ رہے ہیں (اور سابقہ اشاعت کے لمعات میں اس حقیقت کو پھر دہرایا جا چکا ہے) کہ ہمارے نزدیک کمیونزم اور اسلام ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور کوئی شخص جو مسلمان ہونے کا دعویدار ہو وہ کمیونسٹ ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی طرف سے یہ پروپیگنڈا ہوگا کہ طلوعِ اسلام کمیونسٹ ہے تاکہ لوگ اس کی طرف سے پہلے ہی بدظن ہو جائیں۔ اس بات کا ہمیں پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ طلوعِ اسلام نے یہ دعوت دی کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم ہونا چاہیئے۔ چونکہ اس نظام کے قیام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہو جاتا تھا اس لئے انہوں نے طلوعِ اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔ اگر اس مخالفت میں یہ حضرات طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی تعلیم کی تردید کرتے اور اسے غلط بتاتے، تو بھی ایک بات تھی۔ یہ اسے غلط ثابت کر نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی مخالفت کا رُخ بدلا اور یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوعِ اسلام "منکرِ حدیث" اور "اہلِ قرآن" ہے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ لوگ طلوعِ اسلام کی قرآنی دعوت کی طرف آنے ہی نہ پائیں۔ اس طرح یہ لوگ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کو قرآنی دلائل سے تو غلط ثابت کر نہیں سکتے، اس لئے یہ پینترہ بدل کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے کمیونسٹ مشہور کر دیا جائے۔ "لیبل تراشی" ان حضرات کا قدیمی فن ہے۔ ہمارے ہاں شروع سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ معتزلہ ہے، یہ قدری ہے۔ یہ جبری ہے۔ یہ جہمی ہے۔ یہ مقلد ہے۔ یہ غیر مقلد ہے۔ یہ وہابی ہے۔ یہ دیوبندی ہے۔ یہ بریلوی ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے جس کی مخالفت مقصود ہو، اس پر ایک لیبل لگا دو اور اس طرح ذہنوں کا رُخ اصل حقیقت پر غور کرنے کی بجائے، دوسری طرف موڑ دو۔ ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان "لیبلوں" کے اثر میں نہ آئیں بلکہ "نظامِ ربوبیت" میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس پر بچشمِ خویش غور کریں۔ چہ عجب کہ ہماری اس کوشش سے اسلام کی وہ حقیقت آشکارا ہو جائے جس سے "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے" اور جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کی فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے۔

نظامِ ربوبیت کی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں فرد کی زندگی اسٹیٹ کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اسٹیٹ کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہے، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری نشوونما کے ذرائع بہم پہنچائے۔ جس سے وہ اس دنیا میں سرفرازی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے اور اس کے بعد کی زندگی میں حیاتِ جاوید کا اہل بن سکے۔ نیز یہ نظام مستبدانہ طور پر خارج سے ٹھونسا نہیں جاتا بلکہ یہ ان انسانوں کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے جو اس پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں۔ نہ ہی اس کے قیام میں کوئی ایسا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے جو ان مستقل اقدار کے خلاف جائے جو اس نظام کی اس الاصول ہیں۔ "نظامِ ربوبیت" انہی نکات کی تشریح پیش کرتی ہے۔

معاشی ناہمواریاں

سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے اپریل کے آخری ہفتے میں انکم ٹیکس سے متعلق اعداد و شمار شائع کئے ہیں جو مالی سال ۱۹۵۰-۵۱ء سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تاخیر سے شائع ہونے کے بعد یہ اعداد و شمار چنداں مفید مطلب نہیں رہتے کیونکہ وہ ہماری اس معاشی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو چار سال پیشتر تھی۔ اس دوران میں معاشی حالات میں ایسی نمایاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں کہ ان اعداد و شمار کو استنباطِ نتائج کی صحیح اساس نہیں بنایا جا سکتا۔ بورڈ نے اس تاخیر کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اعداد و شمار مرتب کرنے کا طریقہ بڑا پیچیدہ اور وقت طلب ہے۔ البتہ اس نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ اب کام کے دقیانوسی طریقوں کو خیرباد کہہ دیا گیا ہے اور مشینی ذرائع کو استعمال کیا جانے لگا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ آیندہ ضروری اعداد و شمار سال کے خاتمہ کے بہت دیر بعد شائع نہیں ہوں گے۔ غنیمت ہے کہ آٹھ سال میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے یہ راز سمجھ لیا کہ موجودہ "دورِ رفتار" میں اس ڈگر پر قائم نہیں رہا جا سکتا جس پر وہ آبا و اجداد کے وقت سے قائم چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان کا یہ خوش کن وعدہ کس حد تک ایفا پذیر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جائے گا کہ ان اعداد و شمار کی آئندہ قسط متعلقہ سال کے خاتمہ کے کتنی دیر بعد شائع ہوتی ہے۔

چار سال پیشتر کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱۱،۱۱۸ نئے انکم ٹیکس دینے والوں کا اضافہ ہوا۔ (اس تعداد میں وہ تنخواہ دار شریک نہیں جن کا انکم ٹیکس ہر مہینے تنخواہوں میں سے کٹ کر سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتا ہے) گویا گیارہ ہزار سے اوپر ایسے نئے افراد پیدا ہو گئے جن کی آمدنی بڑھ کر ٹیکس کی زد میں آ گئی۔ یہ نتیجہ ہے تجارتی اور صنعتی ترقی کا جو بجائے خویش بڑی قابلِ ذکر اور اہم ہے۔ لیکن اس ترقی سے عوام الناس کو کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہنچا۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جہاں ایک طرف ۲۲۷۶۱ افراد کی مجموعی آمدنی ۹۰،۵۰،۵۰،۰۰۰ روپے تھی وہاں ۲۸۱ افراد کی مجموعی آمدنی ۵،۳۴،۰۰،۰۰۰ روپے تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں تجارت اور صنعت سے جو آمدنی ہوئی وہ معدودے چند ہاتھوں تک محدود رہی۔ بیشتر افراد ایسے ہیں جن کے معیارِ زیست میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ اس ترقی سے فائدہ اٹھانے والوں کا دوسرا گروہ بڑی بڑی کمپنیوں کا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کمپنیوں کی آمدنی مجموعی طور پر ۱۶،۲۶،۰۰،۰۰۰ روپے تھی جس میں سے بڑی کمپنیوں کی آمدنی ۱۴،۳۳،۰۰،۰۰۰ روپے یعنی کل آمدنی کا ۸۲ فی صدی تھی۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ کمپنی چھوٹی ہو یا بڑی اس کی آمدنی چند افراد تک ہی محدود رہتی ہے۔ دونوں صورتوں میں عام حصہ داروں کو بہت کم منافع ملتا ہے گویا انفرادی طور پر دیکھا جائے تو کیا اور کمپنیوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کیا نئی پیدا شدہ دولت کی گردش عام نہیں ہوئی بلکہ وہ سمٹ سمٹا کر چند افراد کے پاس جمع ہو گئی ہے۔ اسی غلط تقسیمِ دولت کا نتیجہ ہے کہ صنعتی ترقی کا فائدہ عوام الناس کو کم سے کم پہنچا۔ مثال کے لئے صرف ایک کپڑے کی صنعت کو لیجئے۔ اس میدان میں پاکستان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ کپڑے میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کپڑا اتنا گراں ہے کہ اوسط درجے کی آمدنی والے افراد اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں امریکہ سے جو مالی مدد مل رہی ہے اس میں سے کروڑوں روپے غیر ممالک سے کپڑا منگوانے پر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اگر صنعتی ترقی جلبِ منفعت کی بجائے ملی بہبود کے لئے ہوتی تو پاکستان کی معاشی حالت بہت بہتر ہوتی۔ ہم نے بارہا اس پر زور دیا ہے کہ افزائشِ دولت مقصود بالذات نہیں، نہ یہ دولت ان افراد کی ملکیت ہے جو اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس اساسی نکتہ کو آج تک نہیں سمجھا گیا اور نتیجہ معاشی ناہمواریوں کی صورت میں ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ یہ عجیب تماشہ ہے کہ جہاں دولت بڑھ رہی ہے وہاں غربت اور فلاکت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ہے بالکل قابلِ فہم۔ جب تک رزق کے سرچشمے ملت کی تحویل میں رہنے کے بجائے افراد کے ہاتھوں میں رہیں گے معاشرہ معاشی فسادہی کا شکار رہے گا۔ قرآن اس حقیقت کو بار بار دہرا رہا ہے۔

اگر عوام سے ان دولت کمانے والوں کا یہ سلوک ہے تو حکومت کے بارے میں بھی ان کا رویہ کچھ کم قابلِ مذمت نہیں۔ مثلاً پیشِ نظر رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ قاعدے کے مطابق ہر اس شخص کو جس کی آمدنی ٹیکس کے قابل ہو جائے، حکومت از خود یہ اطلاع دینی چاہیئے۔ لیکن ۱۹۵۰-۵۱ء میں کسی ایک شخص نے بھی ایسی اطلاع نہیں دی۔ چنانچہ جو رقم ٹیکسوں کی صورت میں وصول کی گئی ہے وہ محکمہ انکم ٹیکس کی کوششوں سے

وصول ہوئی ہے۔ رپورٹ میں مذکور ہے کہ دولت پیدا کرنے والے متنوع حیلوں سے ٹیکس کی ادائیگی سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ مثلاً وہ غلط حصہ دار دکھاتے ہیں۔ کئی طرح کے حساب رکھتے ہیں۔ منافع کی رقوم کو اعزہ و اقارب کے نام بینکوں میں جمع کر دیتے ہیں۔ خریدی ہوئی اشیاء کی قیمتیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ موجود سامان کی قیمت کم بتلاتے ہیں۔ غلط میزان لگاتے ہیں اور نقد بکری کا اندراج ہی نہیں دکھاتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس پر مستزاد رشوت ستانی ہے۔ لہذا یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ جس رقم پر حکومت کو ایک پائی کا بھی ٹیکس نہیں ملتا وہ بھی بڑی معقول ہوگی۔ گویا سرمایہ دار حکومت اور عوام دونوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور عوام اور حکومت دونوں تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ عوام بے بسی سے اور حکومت بے رغبتی سے۔

یہ رپورٹ پرانی ہی سہی لیکن یہ جس مرض کا پتہ دیتی ہے وہ ہمارے معاشرے کو اب بھی گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ پرانی رپورٹ بھی ہمارے ارباب فکر و نظر اور ارباب حکومت کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونی چاہیئے لیکن اگر اس سے علت مرض کا کما حقہٗ احساس نہ کیا گیا اور اس کا مداوا نہ کیا گیا تو ہماری معاشی ترقی ہمارے لئے معاشری مصیبت بن جائے گی۔ یاد رکھئے قومیں ذرائع و اسباب کی کمی سے تباہ نہیں ہوا کرتیں۔ دولت کی غلط تقسیم کے ہاتھوں ہلاکت کے جہنم میں پہنچا کرتی ہیں۔ ہمارے اس دعوے پر خدا کی شہادت کافی ہے

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کا کارنامہ

تقسیم کے بعد پاکستان میں تجارتی اور صنعتی ترقی کا میدان بالکل خالی تھا کیونکہ تقسیم سے پہلے اس پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا اور وہ پاکستان کی معیشت کو معطل کرکے اسے ناکام بنانے کے مذموم ارادہ سے ان علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے مسلمان سرمایہ داروں کے لئے یہ سنہری موقع تھا لیکن چونکہ ابتدائی زمانہ افراتفری کا سا تھا اس لئے نجی سرمائے کا ایک پیسہ بھی صنعتوں کی ترویج و ترقی کے لئے باہر نہ آیا۔ صنعتوں کو نظر انداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ادھر سرمایہ زیادہ لگتا تھا اور منافع کے لئے دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ محض مفاد عاجلہ کے پیش نظر ہمارے سرمایہ داروں نے اپنا پیسہ تجارت میں لگایا اور غیر معمولی حالات سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا اور خوب ہاتھ رنگے۔ رفتہ رفتہ صنعتوں کی کمی کا احساس پیدا ہونے لگا اور حکومت نے اشیائے صرف کی درآمد کم و بیش بند کرکے اور سرمایہ داروں کو چند در چند مراعات دیکر صنعتی ترقی کی طرح ڈالی۔ ان مراعات کے باوصف مطلوبہ سرمایہ باہر نہ آیا۔ یہ حالات دیکھ کر حکومت نے صنعتی ترقی کے لئے ایک کارپوریشن (P. I. D. C.) مقرر کیا جس نے جنوری ۱۹۵۲ء سے آغاز کار کیا۔ اس کارپوریشن نے دو سال کی مدت حیات میں قابل قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ کارپوریشن نے ایسی صنعتیں ہی قائم نہیں کیں جو ساعد حالات میں نجی سرمائے سے قائم ہو جاتیں بلکہ ایسی صنعتیں بھی قائم کیں جن کی طرف نجی سرمایہ توجہ نہیں دیتا۔ کیونکہ ان کی حیثیت زیادہ تر تعمیری ہوتی ہے اور ان پر صرفہ زیادہ اٹھتا ہے اور منافع دیر کے بعد اور کم ملتا ہے۔ گو یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کارپوریشن میدان عمل میں نہ آتی تو ہم صنعتی ترقی نہ کر سکتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک تو کارپوریشن نے نجی سرمایہ داروں کے لئے عمدہ مثال پیش کی، اور دوسرے ایسی اساسی صنعتیں قائم کیں جو نجی سرمایہ داروں کے لئے کوئی دل کشی نہیں رکھتیں۔ ایسی صنعتیں ہر ملک میں حکومت ہی کی نگرانی میں قائم ہوتی ہیں۔

اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارپوریشن اپنے دو سال کے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس نے اس "نئے باب" کا اضافہ کیا ہے کہ کارخانے قائم کرکے اور کامیاب بنا کر نجی سرمائے داروں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اب تک چار چلتے کارخانے بیچ دیئے گئے ہیں۔ اس ذہنیت کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ان کارخانوں میں سرکاری اور پبلک کا ملا جلا پیسہ تھا اور ان کا فائدہ بالعموم ملک کو پہنچتا تھا۔ لیکن اب یہ سارے کا سارا منافع چند افراد تک محدود ہو جائے گا۔ اور افراد بھی وہ جو پہلے ہی دیگر صنعتوں سے کروڑوں روپے کما رہے ہیں۔ اور یہ کیا اس لئے گیا ہے کہ مُلّا نے ان کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا رکھی ہے کہ ذاتی ملکیت از روئے اسلام ایک مقدس حق ہے جسے محدود کرکے مسلمان دنیا و آخرت کی برکتوں سے محروم ہو جائے گا۔ ہم حیران ہیں کہ کارپوریشن کو اپنی محنت کو یوں ہی رائیگاں بنانا تھا تو اس نے یہ بھاڑ جھونکا ہی کیوں تھا۔ اگر اس جوئے شیر کو آخرالامر خسرو کے محل میں ہی پہنچنا تھا تو اس قدر جانگسل اور جگر خراش کوہ کنی کی ضرورت کیا تھی؟ وہ چند سے انتظار کرتی تو جو صنعتیں اس نے چلائیں اور چلا کر نجی سرمایہ داروں کے گلے الکتا زمیں ٹانک دیں وہ اس کے بغیر بھی قائم ہو جاتیں۔ آخر کپڑے، جوٹ وغیرہ کے قابل رشک کارخانے بھی تو نجی سرمایہ داروں نے لگا ہی لئے ہیں۔ کارپوریشن کو یہ پہلے ہی دن سے طے کر لینا چاہیئے تھا کہ وہ صرف ان کارخانوں کی طرف توجہ دے گی جو عام طور پر نجی سرمایہ سے نہیں بنتے۔ کارپوریشن نے اس غلط نگہی اور غلط بخشی سے ملک کے لئے معاشی ناہمواریوں کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔ تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ نجی سرمایہ داروں کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ کارپوریشن کے کارخانے ان کی تحویل میں دیدیئے جائیں۔ یہ مطالبہ ان سرمایہ داروں کا ہے جو اپنا پیسہ اس وقت دبائے بیٹھے رہے جب ملک کو ضروریات زندگی کے لئے دنیا بھر کی منڈیوں کی خاک چھاننا پڑتی تھی۔ انہوں نے پیسہ پہلے تجارت میں لگایا اور جی بھر کر منافع خوری کی۔ پھر حکومت پر دباؤ ڈال کر اشیائے صرف کی درآمد بند کرا کے کارخانے کھولنے شروع کئے۔ عام صارفین اس پالیسی سے بہت پریشان ہوئے لیکن انہیں تسلی دی جاتی رہی کہ یہ قربانی ملک کی صنعتی ترقی کی خاطر کرنا ہی ہوگی۔ اپنے کارخانے چلنے کی دیر ہے ملک میں اشیائے ضروری کی ریل پیل ہو جائے گی۔ خدا خدا کرکے وہ وقت آیا کہ پاکستانی مصنوعات بازاروں میں آنا شروع ہوئیں۔ لیکن اس سے عجیب صورت پیدا ہو گئی۔ ضروریات زندگی ممالک غیر سے درآمد کی جاتی تھیں تو وہ مناسب داموں پر خریدی بھی جا سکتی تھیں۔ اب جو پاکستانی اشیاء بازار میں آئیں اور عوام انہیں خریدنے کے لئے آگے بڑھے تو وہ ان کی قوت خرید سے کہیں باہر تھیں۔ چونکہ باہر سے مال آ نہیں رہا تھا اس لئے ناچار انہیں خرید اگیا۔ اس سے غریب غریب تر ہو گئے اور کارخانے دار دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی بن گئے۔ اس طرح ملک کی دولت میں تو اضافہ ہوا لیکن وہ کارخانہ داروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ملک کے عوام کو اس تک پہنچنا تو ایک طرف وہ اور زیادہ مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ اب پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے اپنی کارخانہ داروں کو چلتے چلائے کارخانے دیدیئے ہیں تاکہ رزق کے زیادہ سے زیادہ سرچشمے کم سے کم ہاتھوں میں مرکوز ہوں اور ملک معاشی جہنم کدہ بن جائے۔

ہم نے طلوع اسلام میں بارہا قرآنی نقطہ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قرآنی نظام میں رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کا کوئی جواز نہیں۔ (اس موضوع پر سیر حاصل بحث "قرآنی نظام ربوبیت" میں ملے گی جو ابھی ابھی ہم نے شائع کی ہے۔) اس سے جو معاشی فساد پیدا ہوتا ہے ہم آج اس میں مبتلا ہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ہمیں تو آج صنعتی ترقی کا موقع ملا ہے۔ یوروپ جو گذشتہ دو سو سال سے صنعتی ترقی میں مصروف ہے اور جو ذاتی ملکیت کا زبردست نقیب ہے، اس کے ہاں بھی ذاتی ملکیت کا تصور عملاً ختم ہو گیا ہے، انگلستان، امریکہ وغیرہ میں ذاتی ملکیت پر زور دینے کے باوجود معاشی رجحان "اجتماعی" ہو گیا ہے۔ ان کا معاشی نظام صریحاً سوشلسٹ ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی انہوں نے بڑے "تلخ تجربوں" کے بعد پیدا کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر ہم قرآن کی راہ نمائی کی طرف سے آنکھیں بند کئے تھے تو کم از کم ان ممالک کی مثال ہی اپنے سامنے رکھتے اور جو غلطیاں ان سے سرزد ہوئیں ان سے بچتے۔ لیکن ہمارے اندھے پن کا یہ عالم ہے کہ ہم اس جہنم کو گذرنا چاہتے ہیں جس سے وہ قومیں گذر چکی ہیں۔ اور تو اور ہندوستان تک نے اپنی معاشی سمت سوشلسٹ کر دی ہے اور وہاں آئین بدلا جا رہا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر معاوضہ دے کر املاک پر قبضہ کیا جا سکے۔ ہندوستان کے وزیر داخلہ پنڈت پنت نے ان دنوں اس سلسلہ میں پارلیمان میں یہاں تک کہہ دیا کہ "ہم اپنی بڑی بڑی سکیموں کو طویل عدالتی بحثوں کے باریک جالوں کی وجہ سے روک نہیں رہے گے ہم ان امور مبہم کو سیدھے سیدھے سرانجام دیں گے"۔ ہندوستان جیسے ذاتی ملکیت کے حامی ملک میں تو عدالت تک کو ذاتی ملکیت کی تحدید سے روکنے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن ہمارے ہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے اور اچھے خاصے قومی اداروں کو ذاتی

ملکیتوں میں دیا جارہا ہے، یہ دیکھتے اور جانتے ہوئے کہ ذاتی ملکیت نے کیا اودھم مچا رکھا ہے۔

ہم کارپوریشن اور حکومت دونوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ خدا کے لئے اس تباہ کن پالیسی کے نتائج پر غور کریں اور ملک کو اس عذاب سے بچائیں جس میں وہ مبتلا ہوتا چلا جارہا ہے۔ یاد رکھئے یہی وہ غلط اقدامات ہیں جو کمیونزم جیسے انسانیت سوز نظام کے لئے فضا سازگار کیا کرتے ہیں جس سے کوئی مقدس قدر سلامت نہیں رہا کرتی فھل من مدکر۔

نمائش!

یوں تو پاکستان کی آٹھ سالہ زندگی کو سمیٹ کر سامنے لایا جائے تو اس کی صحیح تعبیر کے لئے ایک لفظ "نمائش" کافی ہوگا ـــــ علم و حکمت کی اس بہرہ بازی میں، بحث و تکرار کی نمائش۔ مکتب و مدرسہ میں پرانے افکار کی نمائش۔ معاشیات و اقتصادیات میں، خطوطِ خمدار کی نمائش، مرمز و کجدار کی نمائش۔ سیاسیات میں، ہوس کی خونریزیاں چھپانے کو، عقلِ عیار کی نمائش۔ لیکن بعض اوقات یہ نمائش اس قدر بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کا نمائشی لطف بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ دارالحکومت کراچی میں صنعتی اور انجینیری منصوبوں کی ایک "مستقل نمائش" قائم کی جائے گی تاکہ عوام کو بتایا جائے کہ حکومت کے پیشِ نظر "کون کون سے پروگرام اور کون کونسی تجاویز ہیں۔ اس "مستقل نمائش" پر قریب دس لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ کراچی کے بعد پھر اس قسم کی "مستقل نمائش" ڈھاکہ میں بھی قائم کی جائے گی۔

یہ نمائشیں کیوں قائم کی جائیں گی؟! اس لئے کہ امریکہ میں اس قسم کی نمائش گاہیں قائم ہیں!

اگر ہمارے ملک میں کوئی باہوش طبقہ ایسا ہے جس کی آواز ان محلاتِ شاہی میں بسنے والوں کی خوابگاہوں تک پہنچ سکتی ہو تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ان حضرات کے کانوں تک زمانہ کی یہ تلخ حقیقت پہنچا دیں کہ بھوکے کا پیٹ روٹی سے بھرتا ہے، چولھے چوکے۔ توے۔ پرات کے نقشوں سے نہیں بھرتا۔ قوم ایک ایک پیسے کو ترس رہی ہے۔ لاکھوں انسان زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو رہے ہیں اور ہمارے یہ تخیلات کی جنتوں میں بسنے والے اربابِ نظم و نسق ہیں کہ لاکھوں روپیہ نمائش گاہوں کی تعمیر پر صرف کرنے کی سوچ رہے ہیں! اور سوچ اس لئے رہے ہیں کہ "امریکہ میں ایسی نمائش گاہیں بنی ہوئی ہیں"۔ انہیں کون بتلائے کہ امریکہ کی دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اسے دنیا بھر کے گداگروں کی جھولیاں بھرنے کے بعد لاکھوں من اشیائے خوردنی سمندر میں ڈبونی پڑتی ہیں آپ ان کی ریس کرکے یہاں نمائش گاہیں بنوا رہے ہیں!

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ان کے قفس میں کاغذ کے پھول لٹکنے سے بالآخر کب تک کام چلے گا!

"صالحین" کے انداز

ملک کے موجودہ آئینی انتشار میں جماعت اسلامی کا مسلک یہ چلا آرہا ہے کہ جس بات سے حکومت کو زک پہنچے اسے خوب خوب اچھالا جائے، چونکہ اس ضمن میں عدالتوں کی طرف سے بالعموم ایسے فیصلے صادر ہوئے ہیں جن سے حکومت کی پوزیشن کمزور ہوتی تھی اس لئے ان حضرات کی طرف سے شور مچایا جاتا رہا کہ قانون کا احترام سب سے مقدم ہے۔ عدالتوں کے فیصلے کے سامنے ہر ایک کا سر جھکنا چاہیئے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کان میں کہیں سے (شاید) یہ بھنک پڑ گئی ہے کہ فیڈرل کورٹ گورنر جنرل کے حق میں فیصلہ دیدے گی۔ اس لئے اب عدالت کے فیصلے اور قانون کا احترام سب دریا برد ہو رہے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ

> فیڈرل کورٹ نے اگر دستوری کنونشن کے حق میں رائے دیدی اور گورنر جنرل کے لئے دستوریہ کی تحلیل کا حق تسلیم کرلیا۔ تو یقیناً قانونی لحاظ سے اس کو صحیح پوزیشن قرار دیا جائے گا۔ اور ہر شخص اس کے آگے سر تسلیم خم کریگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس سے عوام کی آزادی اور اپنا دستور آپ مرتب کرنے کے بنیادی حق کی نفی نہیں ہوگی؟ ہمیں تعجب ہے کہ اگر ایک مستقل مقننہ کی موجودگی جمہوریت کی نفی ہے تو دستوریہ کی تحلیل اور دستور کی منظوری کے اختیارات کا ایک فرد واحد کے ہاتھ میں مرکوز ہونا کس طرح جمہوریت کی روح کے مطابق ہے؟!
>
> (تسنیم۔ یکم مئی ۱۹۵۵ء)

یعنی اگر کورٹ نے ان حضرات کی منشا کے مطابق فیصلہ دیدیا تو اس فیصلے پر عملدرآمد جمہوریت کی روح کے عین مطابق ہوگا، لیکن اگر اس کا فیصلہ حکومت کی منشاء کے مطابق ہوا تو اس کے مطابق عمل کرنا جمہوریت کی روح کے منافی ہوگا۔

مذکورہ اقتباس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اختیارات کا کسی ایک فرد واحد کے ہاتھ میں مرکوز ہونا جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔ اس ضمن میں اس سے ذرا پہلے تو یہ ہے کہ

> جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گورنر جنرل کو یہ اختیار پہلے ہی حاصل ہو چکا ہے کہ دستوریہ کے منظور کردہ ہر قانون پر اس کی منظوری ضروری ہے تو دستوریہ کی کمزور حیثیت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

یعنی اگر کسی مجلس آئین ساز کے پاس کردہ مسودہ پر رئیس مملکت کی منظوری ضروری ہو تو ان حضرات کے نزدیک یہ چیز بھی جمہوریت کے خلاف ہوگی۔ اور چونکہ یہ حضرات بہرحال اسلام کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے مدعی ہیں، اس لئے ان کے نزدیک یہ چیز خود اسلامی دستور کے بھی خلاف ہوگی۔ لیکن اسی اسلامی جماعت کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جو دستوری خاکہ مرتب فرمایا تھا اس میں رئیس مملکت کے متعلق ارشاد تھا کہ

> امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے۔ یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہوگا کہ وہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

کیا جماعت اسلامی کا ترجمان (تسنیم) بتلائے گا کہ ان کے امیر کا مندرجہ صدر فیصلہ جمہوریت (اور اسلام) کی روح کے مطابق ہے یا اس کے مخالف؟

لیکن اس جماعت کے نزدیک اس قسم کے متضاد فیصلوں میں تطبیق بھی کچھ مشکل نہیں۔ تطبیق کی آسان صورت یہ ہے کہ جب غلام محمد رئیس مملکت ہو۔ تو وہ فیصلہ (جس کی رو سے مجلس آئین ساز کے پاس کردہ قانون پر اس کی منظوری کی ضرورت نہیں) اسلام کے مطابق ہوگا۔ اور جب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب رئیس مملکت ہوں تو پھر یہ فیصلہ (کہ وہ پوری مجلس آئین ساز سے اختلاف کرکے اپنا فیصلہ دے سکتے ہیں) اسلام کے مطابق ہوگا۔ یہ دین کے وہ رموز ہیں جنہیں آپ اور ہم عامی بالکل نہیں سمجھ سکتے۔

غیروں کی نظروں میں

گزشتہ چند دنوں سے مملکت پاکستان میں جو قانونی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق ہم تفصیلی طور پر طوفان تھمنے کے بعد ہی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ملک میں جو ابتری پھیلی ہے۔ اس کے متعلق ایک غیر پاکستانی مبصر کا تبصرہ پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ شاید اسی سے ہماری آنکھیں کھل سکیں۔

مسٹر فلپ ڈین (PHILIP DEANE) "آبزرور ٹائمز" کے خاص تبصرہ نگار ہیں۔ انہوں نے ان کوائف پر "بحران پاکستان" کے عنوان سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> قریب ایک ہفتہ تک پاکستان ایک عجیب دنیائے خلفشار بنا رہا۔ جس میں حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ فوج کے اونچے افسر بلاخوف عقوبت اپنے کمانڈر انچیف سے کہہ سکتے تھے کہ حضور میں کس باغ کی مولی؟ کابینہ کے وزراء کو خود اپنے متعلق علم نہ تھا کہ قلمدان وزارت ان کے ہاتھ میں ہے یا چھن چکا ہے۔ غنڈے اور ڈاکو دھڑلے سے پولیس سے اپنی رہائی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور ان سے معافیاں بھی منگتے تھے یعنی الٹے چور کوتوال کو ڈانٹتے تھے۔ لوگ اس حقیقت کو ماننے سے انکاری تھے کہ ان کی مملکت کا دارالحکومت قانونی طور پر موجود ہے اور اس لئے اس کے احکام کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، سٹہ بازوں کے وارے نیارے تھے۔ کیونکہ پاکستانی سکہ بھی قانونی نہیں رہا تھا۔ مختصراً یہ کہ آپ کو صرف ایک وکیل کی ضرورت تھی جس کی مدد سے آپ جس قدر گڑے مردے چاہے اکھاڑ سکتے تھے۔
>
> (ٹائمز آف کراچی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء)

اس حقیقت حال پر ہم سوائے اس کے کہ اپنی نگاہیں زمین میں گاڑ لیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ قانون کا احترام قوموں کی سربلندی اور سرفرازی کا موجب ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہاں قانون ہی کے احترام کی آڑ میں مفاد پرستوں نے جو دھاندلی مچائی ہے اس سے ہماری قوم کا وقار ذلت کے عمیق گڑھے میں جا گرا ہے۔ یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا۔ وما یضل بہ الا الفاسقین۔ الذین ....

یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض

تاریخی شواہد

(۱۳)

اس "من المسلمین" کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے نگینے کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقام نبوت اور یہی وہ چیز ہے جس میں صحیح اختیار کی پوری شان جلوہ ریز ہوتی ہے پھر یہ کہ قرآن کریم نے جس سب سے پہلے رسول کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ زریں میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ انسان اسی گرامی مرتبت خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیل شرفِ انسانیت کا راز ہے اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضور ختمی مرتبتؐ کے ہاتھوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا گویا سلسلۂ رسالت و نبوت کی داستان قدسی درحقیقت اسلام اور امتِ مسلمہ ہی کی داستان ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے اہم سامیہ آئے جن کا ذکر جلیل آیندہ اوراق کے لئے وجۂ زینت و مایۂ افتخار ہو گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء ہیں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل سے اور اُن سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ○ (۱۷/۳)

(اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا وہ ایک عبد شکور تھا۔

ان ہی کی نسل آگے بڑھ کر مختلف ندیوں اور دریاؤں کی صورت میں صفحۂ ارض پر پھیلی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۫ۖ (۳۷/۷۷)

اور ہم نے اسی نسل کو باقی رہنے والوں میں سے بنایا۔

تاریخ کے اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال آہستہ آہستہ اسی مؤسس اولیٰ کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہد کہن کے متعلق کیا کیا امور منصۂ شہود پر آئیں گے۔ سردست ارباب نظر کے لئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (Deluge) کی داستانیں دنیا کے قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر کرتی ہے۔ یونان، ایران، ہندوستان، چین حتیٰ کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیر الاولین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصہ بڑے دل چسپ انداز میں...... مذکور ہے۔ ست پت برہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی کے لئے غسل کا پانی لایا گیا تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفان عظیم سے نجات دلا دوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا۔ اور اس کی ہدایات کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا۔ جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو دیدوں کو چرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ راز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفان بلا انگیز برپا کر کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں، کیا معلوم آنے والے انکشافات ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصوں کی قدر مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہرحال قرآن کریم میں جس طوفان کا قصہ مذکور ہے اسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک "پرانا قصہ" نہیں۔ اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینہ میں تقدیر اُمم کے خطوط ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین میں اور کونسی نسل سے ہوئی؟ یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کا رُخ اسی طرف ہے کہ اس کی ابتدا عراق کے علاقہ سے ہوئی۔ جہاں کی سامی نسل آنے والی تہذیب و تمدن کی مؤسس تھی۔ اسی قوم میں دجلہ و فرات کی وادیوں میں آج سے قریب چھ سات ہزار سال پیشتر حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس قوم میں طبقات کی تقسیم اور پیشوں کے اعتبار سے تفریق و تمیز شروع ہو چکی تھی۔ ارباب اقتدار و ثروت نے اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت کی جو حکومت و اختیار اور رزق کے سرچشموں کو اُن سے چھین کر خدا کے قانون کے سپرد کر دینے کا مدعی تھا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور یوں دو محاذ بالمقابل پیدا ہو گئے جب ارباب سطوت و اقتدار کا جور و استبداد حد سے بڑھ گیا اور اس امر کا یقین ہو گیا کہ ان کا ناسور لا علاج ہے تو مکافاتِ عمل کے اٹل قانون کے ماتحت، حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کر کے بچا لیا گیا اور باقی سب نذر طوفان ہو گئے۔ مخالفین میں حضرت نوحؑ کا اپنا بیٹا بھی تھا اور آپ کی بیوی بھی۔ لیکن انہیں نبی کی قرابت داری اس ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکی جو ان کی سرکشی کا فطری نتیجہ تھا۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ وہ درحقیقت حضرت نوحؑ کے "اہل" میں سے نہ تھے دنیا میں انسانوں کی تقسیم کا ایک ایسا بنیادی اصول سامنے کر دیا ہے جس نے نسلی، جغرافیائی، لسانی، وطنی حدود و قیود کو مٹا کر ساری تقسیم و تفریق حزب اللہ اور حزب الشیطان کے اصول پر رکھ دی ہے۔

قصۂ حضرت نوحؑ کی تفاصیل تورات میں بھی ہیں لیکن ان تفاصیل کو دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ ان میں ذہن انسانی کی افسانہ طرازیوں نے کس درجہ دخل اندازی کی ہے اور یوں آسمانی تعلیم کو کس طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

"طوفان" کا تذکرہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم کے اساطیر الاولین میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ مزید تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات تمام روئے زمین کی آبادی کی اصل کو شاید اس خطہ کی طرف منسوب کر دیں جس میں طوفان نوحؑ برپا ہوا تھا۔

اس مقام پر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ حضرت نوحؑ نے جس تعلیم کی دعوت دی اس کی مخالفت قوم کے ارباب دولت و اقتدار کی طرف سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعلیم محض "خدا کی پرستش" کے متعلق ہوتی تو اس کی مخالفت خصوصیت سے ارباب دولت و اقتدار کی طرف سے کیوں ہوتی "پرستش" کے معاملہ میں تو عوام سب سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں۔ یہ مخالفت ان کی طرف سے ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ عوام تو اس دعوت کے ساتھ تھے اور اوپر کا طبقہ اس کا مخالف تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس سے ارباب دولت و اقتدار کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات انبیائے کرام جس انقلاب کی طرف دعوت دیتے تھے اس کا بنیادی اصول یہی تھا کہ رزق کے سرچشموں کو افراد کے پنجے سے چھڑا کر قانون خداوندی کے تابع کر دیا جائے تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بن سکیں۔ یہی وہ دعوت ہے جس کی مخالفت ہمیشہ ارباب حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ قرآن نے سب سے پہلی دعوت میں اسی کشمکش کا ذکر کیا ہے اور یہی کشمکش اس کے بعد ہر دعوت میں نظر آئے گی۔

اسلامی معاشرت
از پرویز
قیمت دو روپے

باب المراسلات

روزوں کے احکام

اکال گڑھ (راولپنڈی) سے ایک صاحب کا حسب ذیل مکتوب موصول ہوا ہے۔

طلوع اسلام مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ کالم ۲ میں روزوں کے قرآنی احکام پڑھے پیراگراف ۲، ۳، ۴ تک (س) کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وھو ھذا:

قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ تمام مہینے کے روزے رکھے جائیں۔ اس میں تو صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ رمضان کے مہینے میں روزے رکھو مگر وہ صرف ایام معدودات ہیں۔ ایام جمع قلت و کثرت دونوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں معدودات کا لفظ اسکو قلت سے متعلق کر دیتا ہے۔ "گنے ہوئے" ہر زبان میں قلت کے معنوں ہی میں لئے جاتے ہیں۔ لہذا یہ جمع قلت ہے۔ جس کا اطلاق تین سے نو تک کے اعداد کے لئے ہوتا ہے۔

قرآن میں ایاماً معدودات دوسری جگہوں میں بھی جمع قلت کے معنوں ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً لن تمسنا النار الا ایاماً معدودات، واذکروا اللہ فی ایام معدودات اور حج کے ایام تین ہیں مثلاً ثلاثۃ ایام فی الحج ونیز من تعجل فی یومین اس سے زیادہ اس کے جمع قلت ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ نیز تیس روزے تو پہلی امتوں میں کسی میں بھی نہیں اور پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ الدین یسر۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ تو یہ کیسی آسانی ہے کہ کئی لوگ اس روزے کے طفیل طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کئی تو جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جو دین پیش کیا جا رہا ہے وہ تو دین فطرت ہو نہیں سکتا۔ نمازیں ہیں تو ادھر سے نماز پڑھ کر آؤ پھر دوسری کا بلاوا آیا رہتا ہے۔ اسی کام میں لگے رہو۔ دنیا کا اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہوتا ہے تو یہ عبادت اس کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ نہ آدمی اچھا کپڑا پہن سکتا ہے۔ اور نہ موجودہ فیشن کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ...... اسپیشل ماسٹر انسان بن کر رہے۔ بتلایئے ایسا دین کہیں چل سکتا ہے اور قابل عمل ہے؟

ممکن ہے آپ جمع کثرت یا تیس دنوں کے روزوں پر ہی اصرار کریں۔ لیکن جب ایک لفظ کے معنی آسانی کی طرف بھی لے جاتے ہیں تو آپ یسر کی بجائے عسر کی طرف کیوں جاتے ہیں اور لوگوں کو فتنے میں کیوں ڈالتے ہیں جیسا کہ احادیث میں بھی ہے کہ آپ نے معاذ بن جبل کو لمبی قرآت پڑھنے پر منع فرمایا تھا کہ کیوں لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہو کہ لوگ نماز چھوڑ جاتے ہیں۔

طلوع اسلام | قرآن کریم میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ تم رمضان کے مہینے میں چند دنوں کے لئے روزے رکھو۔ اس نے کہا یہ ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲) یعنی جو تم میں سے اس مہینے میں اپنے مکان پر موجود ہو تو اسے چاہیے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ روزے پورے رمضان کے مہینے کے ہیں۔ نہ کہ رمضان کے مہینے میں تین یا نو دنوں کے قرآن نے اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (گنتی کے دن) اس لئے کہا ہے تاکہ مریض شفایاب ہونے کے بعد اور مسافر اپنے سفر سے واپسی پر یہ گنتی پوری کر لے۔ اسی لئے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اور وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جمع قلت بالعموم تین سے نو تک کے لئے آتی ہے۔ لیکن جب قرآن نے فَلْيَصُمْهُ کہہ دیا تو پھر "ایاماً معدودات" کے معنی اسی کی روشنی میں کرنے چاہئیں۔

عربی صرف و نحو کے متعلق اس اہم حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ قواعد نزول قرآن سے پہلے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اس کے کافی عرصہ کے بعد انہیں مدون کیا گیا تھا۔ ہمارے نحویوں کو چاہیے تھا کہ وہ ان قواعد کی تدوین کے لئے قرآن کو مرکز اور محور قرار دیتے۔ اس لئے کہ قرآن سے بڑھ کر عربی مبین کی صحیح کتاب اور کون سی ہو سکتی تھی! لیکن انہوں نے یہ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مقامات ایسے ہیں۔ جن میں ان کے وضع کردہ قواعد اور قرآن میں مطابقت نہیں۔ اب قرآن کے ان مقامات کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ یعنی صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ نحویوں کے یہ قواعد اصل بنیاد قرار پا گئے ہیں۔ جن کے تابع قرآن کو چلایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ یہ قواعد قرآن کے تابع چلتے۔ لہذا ہمیں قرآنی آیات کے صحیح مفہوم کے لئے خود قرآن کو دیکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن کی آیات کو نحویوں کے ان قاعدوں کی زنجیروں سے باندھ دیں جو قرآن سے کہیں بعد مرتب ہوئے تھے۔

اب رہا "یسر اور عسر" کا سوال تو قرآن نے کہیں یہ کلیہ بیان نہیں کیا کہ "الدین یسر"۔ قرآن نے روزوں کے احکام میں مسافر، مریض اور معذور کے لئے آسانیاں بہم پہنچاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲) یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی نظام میں یسر اور عسر کا فیصلہ افراد پر چھوڑ دیا جائے یعنی انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے یسر سمجھیں اسے اختیار کریں اور جسے عسر سمجھیں اسے چھوڑ دیں تو زندگی کے نظام میں یکسر انارکی پھیل جائے۔

باقی رہا آپ کا یہ کہنا کہ کئی لوگ اس روزے کی طفیل طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور کئی تو جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ تو ان کے لئے قرآن نے پہلے سے گنجائش رکھی ہے یعنی وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ کہ جو لوگ روزے کی مشقت برداشت نہ کر سکیں۔ ان کے لئے فدیہ۔ روزوں کے ساتھ ہی نماز کے متعلق بھی آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت ہمارے سامنے دین کا نظام موجود نہیں۔ اس لئے لوگوں کو یہ چیزیں بے کار سی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر دین کا نظام سامنے ہو تو پھر یہ حقیقت خود بخود سمجھ میں آ جائے کہ اس عظیم پروگرام میں ان ارکان کا کیا مقام ہے اور یہ کس قدر تابناک اور حیات بخش نتائج کے حامل بنتے ہیں۔ اس وقت یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو لباس فرائض کی سرانجام دہی میں حائل ہو۔ وہ پھاڑ کر پھینک دینے کے قابل ہوتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک سپاہی عند الضرورت بلاتامل زمین پر لیٹ جاتا ہے اور کبھی یہ نہیں سوچتا کہ میرے کپڑے مٹی میں لت پت ہو جائیں گے۔ آپ تو صرف کپڑوں ہی کا کہتے ہیں۔ ایک مومن تو قدم قدم پر اس کا اعلان کرتا ہے کہ محیای و مماتی للہ۔ میرا مرنا اور میرا جینا سب کچھ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ جو خدا نے میرے لئے تجویز کیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے یہ باتیں نکھر کر سامنے اس وقت آ سکتی ہیں۔ جب دین ایک نظام کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہو۔

پرویز صاحب سے ایک سوال

محترم محمد عبداللہ صاحب شاہ پور صدر سے پرویز صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ

"آپ چونکہ حدیث شریف کے قائل نہیں ہیں محض قرآن مجید کو حسبنا کتاب اللہ کہہ کر قابل عمل و کافی سمجھتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں بار بار اقیموا الصلوٰۃ ہے، آپ مجھے از روئے قرآن ترکیب نماز سے مطلع فرمائیں۔ حدیث و رجال و طریق امت سے بالاتر رہ کر قرآن مجید سے دلیل نقلی پیش فرمائیں۔ اور آپ بھی سنا ہے بہت نیک اور نمازی ہیں، آپ کیسے نماز پڑھتے ہیں۔ اور کیوں اس طرح پڑھتے ہیں؟"

طلوع اسلام | آپ کی یہ اطلاع درست نہیں کہ میں حدیث کا قائل نہیں۔ میں قرآن اور حدیث دونوں کو ان کے اپنے اپنے مقام پر مانتا ہوں۔

(۲) آپ کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ میں دین کی جزئیات تک کے لئے بھی قرآن کو کافی سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم بالعموم دین کے اصول عطا کرتا ہے جو ہر طرح سے مکمل اور ناقابل تغیر و تبدل اور حک و اضافہ ہیں۔ یہی مفہوم حسبنا کتاب اللہ کا ہے۔ لہذا نماز کی جزئیات اور ترکیب تمام و کمال قرآن کے اندر نہیں۔ انہیں رسول اللہ نے مرتب فرمایا تھا۔ بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہو گیا۔

(۳) میں اس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ جس طرح جمہور مسلمان پڑھتے ہیں۔ اس میں نہ میں اور نہ کوئی اور فرد کسی قسم کے رد و بدل کا مجاز ہے۔ (پرویز)

(طلوع اسلام اس بارے میں اپنا مسلک کئی بار واضح کر چکا ہے اور ہم بار بار اس کی وضاحت اس لئے کرتے ہیں کہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ ہم نہ خود مغالطہ میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی کو مغالطے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہفتہ وار ہونے کے بعد بھی یہ وضاحت

(باقی ۱۷ پر)

مجلسِ اقبال

اسرارِ خودی

تمہید

گذشتہ مجالس میں علامہ اقبالؔ کی اختراع واختیار کردہ اصطلاح "خودی" اور اس کے فلسفہ کے تعارف کے سلسلہ میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے، کہ ہمارا خیال ہے کہ اب اس اصطلاح اور اس کے تضمنات کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ لہٰذا اب ہم اصل کتاب کی طرف آتے ہیں۔

جب "اسرارِ خودی" سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تو اس کے شروع میں ایک مقدمہ (نثر میں) اور سید علی امام مرحوم کے نام پیش کش (نظم میں) تھی۔ بعد کے ایڈیشنوں میں انہیں حذف کر دیا گیا۔ جو ایڈیشن اس وقت ہمارے پیش نظر ہے (یعنی اشاعتِ چہارم) اس کا آغاز رومیؔ کے ان تین اشعار سے ہوتا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

یہ آرزو (یعنی انسان کی تلاش) خود فکر و کاوشِ اقبالؔ کا نقطۂ پرکار ہے اور وہ تو یہانتک بھی کہہ گئے ہیں کہ

خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

لیکن یہ "آدم" جس کی ان سب کو تلاش ہے، ہنوز آب و گل میں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

یکے در معنئ آدم نگر، از من چہ می پرسی　　ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے　　کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے

یعنی

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

لہٰذا جس "آدم" کے متعلق رومیؔ نے کہا کہ "یافت می نشود" (وہ نہیں ملتا) اقبالؔ کو اس آدم کے ملنے کا امکان ہی نہیں، یقین بھی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا کہ

فطرتِ زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "زمانے کے تقاضے" اب اس طرح دنیا کو کشاں کشاں، قرآنی حقائق سے قریب تر لاتے جا رہے ہیں کہ کچھ بعید نہیں کہ وہ معاشرہ جسے ابنِ آدم کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے سازگار بننا ہے، مستقبل قریب ہی میں وجود میں آجائے اور (قرآن کے الفاظ میں) "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

رومیؔ کے ان اشعار کے بعد اسرارِ خودی کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس تمہید کے سرِ عنوان، نظیریؔ کا یہ شعر درج ہے:

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

قرآن کی رو سے، کائنات میں نہ تو کوئی شے باطل ہے اور نہ ہی شر۔ اشیائے کائنات کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور یہ ان کا استعمال ہے جو انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ اگر کائناتی قوتیں یا اسباب و ذرائع پیداوار، فروغ و استحکامِ خودی، یا نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے استعمال کی جائیں تو یہ خیر میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر ان کا نتیجہ ضعفِ خودی، یا ابنِ آدم کی سامانِ پرورش سے محرومی ہو جائے تو یہی شر بن جاتی ہیں۔ لہٰذا اشیاء رد تو اسے کائنات کو وہ خام مسالہ سمجھنا چاہیئے جسے ہم اپنے پیش نظر پروگرام کی تکمیل کے لئے جس طرح جی چاہے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہی صورت افراد کی بھی ہے۔ جس انسان میں جس قسم کی صلاحیت کی فراوانی ہے، اُسے اپنی صلاحیت کو اس قسم کے کام میں صرف کرنا چاہیئے۔ بس مقصد پیش نظر یہ ہے کہ وہ صلاحیت اس کی اپنی ذات کی پختگی اور نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کا موجب بنے اور اس طرح کائنات کے حسن میں تعمیری اضافے کرتی چلی جائے۔ یہی وہ تلقین ہے جو اقبالؔ نوجوانانِ ملت کو کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ

آفریدند اگر شبنمِ بے مایہ ترا　　خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند　　پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابانِ تو برکند ترا　　صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز

دنیائے مذاہب و تصوف میں دیکھئے۔ ان کا ضابطۂ اخلاق انسان میں صرف ایک خاص قسم کی صفات اجاگر کرتا اور اسے ایک خاص ٹائپ کا انسان بناتا ہے — عاجزی، بے کسی، بے چارگی، نرمی، انکساری، پیار اور محبت کا مجسمہ — جو صفات ان کے خلاف ہوتی ہیں، وہ انہیں دباتا اور فنا کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا تصور اس باب میں ان سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کا خدا متضاد صفات کا حامل ہے۔ جہاں وہ رؤف و رحیم ہے، وہاں وہ جبار و قہار بھی ہے۔ لیکن اس کی یہ تمام صفات اس حسنِ تناسب و توازن کے ساتھ یکجا جمع ہیں کہ ان کا ظہور ہمیشہ خیر کے لئے ہوتا ہے۔ تضاد میں اس قسم کا کامل توافق، یہ ہے مفہوم اسماء الحسنیٰ کا۔ مردِ مومن اپنے اندر انہی صفات خداوندی کو (علیٰ حدِ بشریت) اجاگر کرتا جاتا ہے۔ اس لئے وہ صرف کسی خاص ٹائپ کی صفات کا حامل نہیں ہوتا بلکہ ان تمام متضاد صفات کا مجموعی پیکر ہوتا ہے۔ اگر ان صفات میں حسنِ تناسب نہ رہے تو اس کا نتیجہ شر اور فساد ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ان میں پورا پورا اعتدال و تناسب ہے تو یہ کائنات میں خیر اور صلح کا مظہر بن جاتی ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ کس مقام پر کس قسم کی صفت کا ظہور ہونا چاہیئے۔ اور یہ چیز قرآن کریم کی راہ نمائی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے کہا ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

محمد رسول اللہ والذین معہٗ اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

یہ وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی مثنوی کی تمہید کے سرِ عنوان نظیریؔ کا یہ شعر لکھا ہے کہ

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اسلام میں منبر اور دار دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور اپنی اپنی ضرورت و مصلحت۔ منبر بغیر دار کے محض "وعظ" بن کر رہ جاتا ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اور دار بغیر منبر کے خالص استبداد و بربریت۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

منبر اور دار دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اسلام۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

اس کے بعد اسرارِ خودی کی اصل تمہید شروع ہوتی ہے۔

فردوسِ گم گشتہ

از پرویز

ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔

خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۱۷۶ صفحات قیمت چھ روپے۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں جزیرۂ عرب اور عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات اور جزیرہ میں نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی ہے۔ آج کی صحبت میں عربوں کی طبیعت عقلیہ سے بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں علمائے عمرانیات اور دیگر محققین کی آراء پیش کی گئی ہیں یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ عقلی اعتبار سے عربوں کا کیا مقام تھا، اور ان کی خصوصیات اور امتیازات کیا تھے۔

وہ تمام باتیں جو عرب لوگ دوسروں سے نقل کرتے تھے صحیح طور پر ہو بہو نقل نہیں ہوتی تھیں۔ اکثر ان میں تبدیلیاں واقع ہو جاتی تھیں جیسا کہ عربوں کی ان بعض ضرب الامثال میں ہمیں نظر آتا ہے۔ جو امثال سلیمان سے منتقل ہوئی ہیں۔ نیز ان قصوں میں دکھائی دیتا ہے جو ایران اور روم سے نقل کئے گئے ہیں۔ عرب لوگ اپنے پڑوسیوں سے اس طرح منظم علم کے طور پر کچھ حاصل نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم لوگ آجکل یورپین تہذیب حاصل کرتے ہیں کیونکہ وہاں اس قسم کے موانع موجود تھے جو انہیں اس سے باز رکھتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو طبعی موانع تھے جو عربوں اور دیگر اقوام میں حائل تھے۔ مثلاً سمندر، پہاڑ، صحرا اور کچھ وہ بڑا بُعد جو عربوں، ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ہیئت اجتماعیہ اور درجہ عقلیہ کے اعتبار سے موجود تھا۔ کیونکہ اکثر مدنیت اور تہذیب کا حصول اسی وقت بسہولت ہو سکتا ہے۔ جبکہ دونوں عقلیتیں قریب قریب ہوں۔ نیز عربوں کی اس زمانہ کی جہالت بھی مانع آتی تھی۔ جب کہ ان میں کوئی لکھا پڑھا آدمی شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا۔ جو لوگ ایرانیوں اور رومیوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ وہ ان کی دبی حکمت و عظمت کی باتیں اور قصے کہانیاں یا تاریخی حوادث نقل کرتے تھے جو بآسانی انھیں یاد رہ سکتے تھے اور جنھیں ایک بدوی آدمی یا بدوی تمدن آدمی ہضم کر سکتا تھا۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ عربوں اور ان غیر عربی قوموں میں ایسے تعلقات موجود تھے۔ جو عربوں کی مادی اور ادبی زندگی پر اثر انداز تھے۔ اور اسی امر کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے

تیسری فصل

عربوں کی طبیعت عقلیہ

قومیں عقلی اور نفسی اعتبار سے بہت مختلف ہوتی ہیں ایک انگریز کی عقلیت ایک فرانسیسی کی عقلیت سے مختلف ہوتی ہے اور ان دونوں کی عقلیت ایک مصری کی عقلیت سے متفاوت ہوتی ہے و قس علی ہذا۔ یہ نفسیتیں اور عقلیتیں درحقیقت خانگی اور اجتماعی حالات کے ماتحت متشکل ہیں جو ہر قوم کو محیط ہوتی ہیں۔ دنیا میں قومیں مختلف درجات پر فائز ہوتی ہیں، جو مسلسل اوپر کو بڑھتے جاتے ہیں اور ہر درجے کے اپنے عقلی اور نفسی ممیزات ہوا کرتے ہیں۔

ایک قوم کے افراد اگرچہ مدارک عقلیہ، تربیت اور تعلیم وغیرہ کے لحاظ سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، تاہم ان سب میں ایک مشترک وحدت موجود ہوتی ہے۔ اس مشترک وحدت کا ادراک تم جسمانی ساخت میں کر سکتے ہو، چنانچہ تھوڑی سی مشق کے بعد تم یہ حکم لگا سکتے ہو کہ فلاں آدمی انگریز ہے۔ فلاں فرانسیسی ہے اور فلاں مصری ہے۔ اسی طرح ایک قوم کے افراد میں ایک عقلی وحدت بھی ہوا کرتی ہے۔ جو بالکلیہ وحدت جسمیہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ عربوں کی یہ عقلی اور نفسی وحدت کیا تھی؟ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اگر ہم نمونے کے طور پر ایک عربی شخص کو منتخب کریں جو عربوں کی نفسیات کا نمائندہ ہو سکے۔ تو اس کی صفات کیا ہونگی؟

اس موضوع پر محققین کی آراء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ہم ان آراء میں سے چند آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ عربوں کے متعلق بعض علمائے عمرانیات کا خیال ہے۔ کہ عجمی اقوام میں تو ان کے ہر حصۂ زمین میں بادشاہ ہوتے تھے، جو ان کی حفاظت کرتے تھے۔ شہر ہوتے تھے جہاں وہ مل جل کر رہتے تھے۔ احکام و قوانین ہوتے تھے جن کی وہ پابندی کرتے تھے۔ فلسفہ اور علم و فن ہوتا تھا جسے وہ پیدا کرتے تھے۔ صنعتیں حرفتیں ہوتی تھیں جنہیں وہ بناتے تھے مثلاً دیباج کی صنعت، شطرنج کا کھیل، پولو کی گیند اور مثلاً رومی فلسفہ کی تخلیق، قانون اور اصطرلاب وغیرہ لیکن عربوں میں نہ کوئی بادشاہ تھا۔ جو ان کے عوام کو مجتمع رکھ سکتا۔ دور دراز کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملا سکتا، ظالموں کو قلع قمع کر سکتا، بیوقوفوں کو حماقت سے روک سکتا۔ نہ ہی ان کی کوئی صنعتی پیداوار تھی۔ اور نہ ہی فلسفہ اور علم و فن سے ان کو کوئی لگاؤ تھا۔ لے دے کے ان کی علمی اور فنی تخلیق ان کے وہ اشعار تھے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اس فن میں عجمی لوگ بھی ان سے فروتر نہیں تھے، چنانچہ رومیوں کے کئی عجیب و غریب اشعار پائے جاتے ہیں جو عروض اور وزن کے اعتبار سے صحیح کہے جا سکتے ہیں۔[1]

۲۔ جاحظ ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے اور عربوں اور غیر عربوں میں مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اہل ہند کے ہاں مدون مضامین اور مجلد کتابیں موجود تھیں۔ مگر ان کو کسی ایک آدمی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کسی ایک عالم کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ کتابیں ان میں وراثتاً چلی آ رہی ہیں ان کی نوعیت اس قسم کے علوم و آداب کی ہے جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یونانیوں کے ہاں فلسفہ اور منطق ملتی ہے۔ لیکن ان کے ہاں خود منطق والا گونگا ہے، جسے خود بیان و خطابت کا سلیقہ کبھی نہیں آیا۔ ایران میں خطیب ملتے ہیں، لیکن ایرانیوں کی ہر بات اور ان کا ہر مضمون طویل غور و فکر، کوشش و خلوت کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس عربوں کے ہاں جو چیز بھی ملتی ہے۔ وہ بدیہہ گوئی اور ارتجال کا نمونہ ہوتی تھی۔ گویا کہ وہ الہام ہوتا تھا۔ جہاں نہ مشقت کشی ہوتی تھی اور نہ محنت گزینی۔ نہ فکر کو حرکت دینا پڑتی تھی اور نہ کسی چیز سے مدد لی جاتی تھی، جوں ہی انھوں نے اپنی قوت واہمہ کو حرکت دی مضامین فوج در فوج آسمان سے اترنے لگتے" اور الفاظ سانچوں میں ڈھلنا شروع ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ اُمی تھے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ فطرت کے پروردہ تھے تکلف برتنا ان کو آتا ہی نہ تھا بہترین کلام بکثرت ان کے ہاں موجود تھا۔ اور انھیں اس پر پوری قدرت حاصل تھی۔ یہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو دوسرے لوگوں کے علوم کو یاد رکھیں اور متقدمین کے کلام کی پیروی کریں۔ وہ لوگوں کے اشعار کو یاد نہیں کرتے تھے بجز ان اشعار کے جو خود ہی ان کے دلوں میں پیوست سینوں میں چسپاں اور عقول میں جاگزیں ہو کر رہ جاتے تھے، اس کے لئے نہ وہ کوئی ارادہ و تکلف برتتے تھے اور نہ ہی تلاش و جستجو کرتے تھے اور نہ حفظ کرتے تھے"۔[2]

۳۔ عربوں کے بارے میں ابن خلدون کی رائے۔ عربوں کے متعلق ابن خلدون کی یہ رائے ہے ان کی تاریخ میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہے تاہم انہی کے الفاظ میں ہم اس کا خلاصہ پیش کئے دیتے ہیں۔ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ عربوں کی حالت اس اجتماعی اور طبیعی حالات کے مطابق ہے جس پر ہر انسان اپنے نشو و ارتقاء کے دور میں گزرتا ہے۔ اس مضمون کو وہ اپنے ان الفاظ کے ذریعہ تعبیر کرتے ہیں کہ "عرب اقوام خلقی طور پر طبیعی اور فطری طریقہ پر ہیں" نیز وہ کہتے ہیں کہ "عرب اپنی فطری وحشت و بربریت کی بنا پر جس میں وہ گرفتار چلے آتے ہیں۔ لوٹ مار کرنے والے لوگ ہیں۔ جو بیکار کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ جن لوگوں پر انھیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے وہ انھیں لوٹ لیتے ہیں۔ اس طرف انھیں کوئی توجہ نہیں ہوتی کہ وہ ان پر غلبہ اور تسلط حاصل کر کے کوئی گراں قدر کام انجام دے سکیں لوٹ مار کرنے کے بعد کھلے میدانوں میں جو ان کا وطن ہوتے ہیں وہ بھاگ جاتے ہیں۔ البتہ وہ قبائل جو دشوار گذار پہاڑیوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح محفوظ پوزیشن کے مالک ہو گئے ہیں ان کی بیہودگیوں اور فسادات سے محفوظ رہتے ہیں لیکن جو لوگ میدانی زمینوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ سامان حفاظت کے فقدان اور حکومت کی کمزوری کی وجہ سے جب بھی ان لوگوں کی زد پر آ جاتے ہیں۔ ان کی لوٹ مار کا شکار بن جاتے ہیں۔ وہ برابر ان پر لوٹ مار کرتے رہتے ہیں، تا آنکہ یہ لوگ ان سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور پھر جلد جلد حکومتوں کی تبدیلیوں اور سیاست کے بگاڑ کی وجہ سے وہ اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کی تہذیب اور مدنیت بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے"۔[3]

اقبال پر اپنی قسم کی پہلی کتاب
اقبال اور قرآن
(از پرویز)

[1] العقد الفرید ص ۲۷ ج ۲ [2] البیان والتبیین ص ۱۵ ج ۲ [3] ابن خلدون ص ۱۳۵

سب سے پہلے اور سب سے بڑے مفسر[1]

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری

(از علامہ تمنا عمادی مد ظلہ)

ابن جریر طبری وہ امام ہیں جنہوں نے سب سے پہلے تفسیر کی کتاب لکھی اور اس کے ساتھ ہی تاریخ کی کتاب بھی لکھی۔ ان کی تفسیر اور تاریخ سنیوں کے ہاں بڑی قدر و منزلت سے دیکھی جاتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد جس قدر تفاسیر اور تواریخ لکھی گئی ہیں ان کی عمارت امام طبری ہی کی رکھی ہوئی بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ علامہ تمنا نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ امام ابن جریر طبری درحقیقت شیعہ تھے۔ اگر یہ شیعہ تھے تو آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ اہل سنت والجماعت جس تفسیر اور جس تاریخ کو اتنا معتبر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے اور اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارتیں کس درجہ قابل اعتماد ہو سکتی ہیں

ہمارے دور میں علامہ تمنا فن رجال میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس باب میں ان کی دور رس نگاہیں اس اس مقام تک پہنچتی ہیں جو دوسرے لوگوں کے حاشیۂ خیال تک میں بھی نہیں ہوتیں۔ اس اعتبار سے ان کے مقالات بڑے محققانہ ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ایک ایسے مفسر اور مورخ کو، جسے سنی حضرات استاد تبعاؤ تقدام مانتے ہیں، شیعہ ثابت کیا جائے، تو ان حضرات کی طرف سے اس تحقیق کی مخالفت ضرور ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جب امام طبری کے طرف تشیعیت کی نسبت کی جائے گی تو اس ضمن میں بہت سی باتیں شیعہ حضرات کے متعلق بھی سامنے آ جائیں گی۔ جیسا کہ اس سے پہلے متعدد بار کہا جا چکا ہے۔ طلوع اسلام نہ سنی ہے نہ شیعہ۔ اس کی نسبت کسی فرقہ سے بھی نہیں۔ اس لئے اس میں جو کچھ شائع ہوتا ہے اس سے نہ کسی فرقہ کی تائید مقصود ہوتی ہے نہ کسی کی تردید۔ اس میں اس قسم کے مضامین محض تحقیق کی غرض سے شائع ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت خالص علمی ہوتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین زیر نظر مقالہ کو بھی اسی نگاہ سے دیکھیں گے اور اسے سنی یا شیعہ فرقوں میں سے کسی کی تائید یا تردید پر محمول نہیں کریں گے۔

یہ مضمون متعدد اقساط میں مکمل ہوگا۔ (طلوع اسلام)

رجال و تاریخ والے لکھتے ہیں کہ "ابوجعفر محمد بن جریر الطبری" ایک ہی زمانہ میں دو تھے، اور دونوں بڑے عالم، بڑے فاضل، بڑے ادیب، اور صاحب تصانیف تھے۔ مگر ان میں ایک تو کٹر رافضی تھے اور دوسرے ہلکے پھلکے شیعے تھے۔ دونوں کا نام ایک، ولدیت ایک، کنیت ایک، وطن ایک، اور زمانہ ایک، پھر مشرب بھی تقریباً ایک ہی۔ فرق پیدا کیا گیا ہے تو صرف دادا کے نام کا۔ یعنی صاحب تفسیر و تاریخ جو محض ہلکے پھلکے شیعے تھے ان کے دادا کا نام "یزید" تھا اور دوسرے جو کٹر رافضی تھے ان کے دادا کا نام "رستم" تھا۔

شیعہ حضرات کی کتاب رجال میں "ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری" کا ذکر کافی شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر ہے اور "ابن جریر بن یزید" کا ذکر مختصر طور سے کرکے لکھ دیا ہے کہ کان عامیّ المذھب یعنی یہ اہل سنت تھے، شیعہ حضرات اپنی کتابوں میں اہل سنت کو عامہ یعنی عوام لکھتے ہیں، اور سنی کو "عامیّ المذھب" یعنی عوام کا مذہب رکھنے والا۔ اور اہل سنت کی کتب رجال میں "ابن جریر بن یزید" کا ترجمہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد تمیز کے لئے "ابن جریر بن رستم" کا بھی کچھ ذکر کر دیتے ہیں۔ اور لکھ دیتے ہیں کہ یہ غالی رافضی تھے۔

امام ذہبی، میزان الاعتدال میں اور علامہ ابن حجر العسقلانی، لسان المیزان میں ابن جریر بن یزید صاحب تفسیر و تاریخ کے متعلق اس کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ فیہ تَشَیُّعٌ یعنی ان میں شیعہ پن تھا مگر ان کے تشیع کو ہلکا کرنے کے لئے حد سے زیادہ کوشش کرتے ہیں، چنانچہ امام ذہبی لکھتے ہیں "فیہ تَشَیُّعٌ یسیر" وموالاۃ لا تضر یعنی ان میں تشیع تھا۔ اور حضرت علی اور ان کے اہل بیت کے ساتھ کچھ غیر معمولی موالات تھی جو ضرر رساں نہیں ہو سکتی۔

ابن حجر عسقلانی لسان المیزان میں امام ذہبی کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں۔ مگر "فیہ تشیع" کے بعد اپنی طرف سے "یسیر" کا لفظ بڑھا دیتے ہیں۔ یعنی ان میں تشیع تو تھا مگر ہلکا پھلکا۔

امام ذہبی نے امام سلیمانی علامہ حافظ احمد بن علی پر الزام دیا ہے کہ انھوں نے بڑا ظلم یہ کر دیا کہ ابن جریر بن یزید کے متعلق لکھ دیا کہ کان یَضَعُ لِلرَّوافِض یعنی یہ رافضیوں کی حمایت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن جریر تو کبار ائمہ اسلام میں سے تھے۔ سلیمانی نے محض ان پر اتہام کیا ہے اور بڑا غضب کیا ہے، پھر خود ہی امام ذہبی لکھتے ہیں کہ علما کا کلام جو بعض کا بعض کے متعلق ہو اس میں توقف کرنا چاہیئے۔ یعنی یہ لوگ برابر کے تھے ان میں باہم چشمکیں بھی رہتی تھیں۔ اس لئے اگر ایک دوسرے کے متعلق کچھ کہا جائے۔ تو دوسروں کو ان کے آپس کی باتوں سے متاثر نہ ہونا چاہیئے۔

پھر امام ذہبی[2] یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاید علامہ سلیمانی نے ایسا جملہ دوسرے ابن جریر یعنی ابن رستم کے متعلق کہا ہو۔

حافظ ابن حجر امام ذہبی کی پوری عبارت نقل کرکے لکھتے ہیں کہ "اگر میں قسم کھاؤں کہ علامہ سلیمانی نے جو الزام ابن جریر پر لگایا ہے اس سے ان کی مراد وہی ابن جریر بن رستم رافضی ہے (ابن جریر بن یزید مفسر نہیں) تو میں اپنی قسم میں نیک کار یعنی سچا رہوں گا (اس کو کہتے ہیں عقیدتمندانہ جذبۂ روایت پرستی کا غلو) کیونکہ علامہ سلیمانی حافظ حدیث ہیں۔ متقی ہیں۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کے دماغ سے کون سی بات نکل رہی ہے اس لئے میں ہرگز یہ اعتقاد نہیں رکھ سکتا کہ انھوں نے ایسے امام پر ایسا باطل حملہ کیا ہوگا۔ اتنا لکھ کر فوراً ہی ابن حجر لکھتے ہیں واللّٰہ اعلم۔ (اس "واللّٰہ اعلم" سے ہر فریق اپنے موافق پہلو نکال سکتا ہے)

پھر ابن حجر لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ الشیوخ ابوحیان کو بھی علامہ سلیمانی کے قول نے دھوکا دیا۔ کہ انھوں نے اپنی تفسیر کے اوائل میں لفظ صراط پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قال ابوجعفر الطبری وھو امام من ائمۃ الامامیۃ الصراط بالصاد لغۃ قریش الخ یعنی ابوجعفر طبری جو فرقہ امامیہ میں سے ایک امام ہیں۔ ان کا قول ہے کہ صراط صاد سے قریش کی زبان ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ ابن جریر طبری کو اشتراک نے نقصان پہنچایا۔ نام کا اشتراک، کنیت کا اشتراک باپ کے نام کا اشتراک، نسبت کا اشتراک، اور پھر معاصرت، اور ان سب پر کثرت تصانیف۔ اتنا لکھ کر پھر ابن حجر لکھتے ہیں والعلم عند اللّٰہ یہ "والعلم عند اللّٰہ" پہلے "واللّٰہ اعلم" کی طرح دو پہلو نہیں ہے بلکہ یہ "واللّٰہ اعلم" اور "والعلم عند اللّٰہ" دونوں جملے غمازی کر رہے ہیں کہ خود ابن حجر کے دل میں بھی کچھ کھٹک تھی۔ اور ان کی فطرت سلیمہ اور مہارت فن ان کو ابن جریر طبری کی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی تھی مگر روایت پرستی کا غلو ان کو مجبور کرتا تھا کہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاؤ اور علامہ سلیمانی جیسے امام فن اور اپنے شیخ الشیوخ ابوحیان کی شہادتوں کی طرف کان نہ دو۔ اور ابن جریر کو اہل سنت ہی کہتے رہو۔ ورنہ یہ تفسیر و تاریخ کے سارے ذخیرے تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں گے)

پھر ابن حجر لکھتے ہیں وانما نُبِزَ بالتشیع لانہ صحح حدیث غدیر خم یعنی ابن جریر مفسر پر جو شیعیت کا الزام لگا۔ وہ صرف اس لئے کہ انھوں نے "غدیر خم" والی حدیث (من کنت مولاہ فعلی مولاہ) کو صحیح قرار دیا ہے (کیونکہ اگلے تمام محدثین کے نزدیک یہ حدیث موضوع اور شیعوں کی من گھڑت ہے۔ شیعہ حضرات کے سوا کوئی فرد بھی اس حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ اور آج بھی محققین اس حدیث کو موضوع ہی سمجھتے ہیں مگر شیعوں اور ان کے رفیق کار صوفیوں کے پروپاگنڈے نے اس حدیث موضوع کو اتنا مشہور کر دیا کہ کچھ اہل سنت بھی اس کو صحیح حدیث سمجھنے لگے اہل سنت میں تفضیلیہ فرقہ اسی قسم کی جھوٹی حدیثوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔

اس کے بعد ابن حجر نے ابن جریر کے سنی ہونے کے ثبوت میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ یہ کہ واخرج ابن عساکر من طریق محمد بن علی بن سھل بن الامام۔ قال سمعت اباجعفر الطبری وذُکِرَ علیؓ رض فقال ابوجعفر من قال ان ابابکر وعمر رضی

---

[1] ابن جریر طبری سے بھی بعض متقدم مفسرین کا ذکر کتابوں میں ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعضوں نے اتنی جلدوں میں اپنی تفسیر مکمل کی تھی مگر وہ تفسیریں جب دنیا کی نظروں کے سامنے صدیوں سے نہیں ہیں تو ان کا ذکر ہی فضول ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تفسیریں صحیح ہوں اس لئے ملاحدۂ عجم ہی نے ان کو ضائع کر دیا ہو۔ سب سے قدیم تفسیر ابن جریر ہی کی دنیا کے سامنے ہے۔ اس لئے یہی زیر بحث آ سکتی ہے۔

[2] امام ذہبی کی میزان الاعتدال اور حافظ ابن حجر کی لسان المیزان انہیں راویان احادیث و تفسیر کے حالات میں ہیں جو کم و بیش مجروح ہیں اور ائمہ حدیث نے جن کی حدیثیں کم قبول کی ہیں یا جن کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ میزان الاعتدال میں تو صحاح کے راوی بھی کچھ ہیں مگر لسان المیزان میں صحاح کے راوی ایک بھی نہیں۔ ابن جریر سے صحاح میں کوئی روایت بھی نہیں ملی۔ آخر کیوں؟ متاخرین ان کی حمایت

اللہ عنہما لیسا بامامی ھدیٰ الیش ھو؟ فقال لہ الطبری منکرا علیہ مبتدع، مبتدع ھذا؟ یُقتَلُ من قال ان ابا بکر وعمر لیسا باما می ھدیٰ یُقتَلُ یُقتَل۔ یعنی ابن عساکر بطریق محمد بن علی بن سہل بن الامام روایت کرتے ہیں کہ ابن الامام نے کہا کہ میں نے ابو جعفر طبری کو کہتے ہوئے سنا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ ابو جعفر نے کہا کہ جو شخص یہ کہے کہ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) ہدایت کے امام نہ تھے، وہ کیا ہے؟ ابن الامام نے کہا کہ وہ بدعتی ہے تو ابن الامام کی بات کا انکار کرتے ہوئے ابو جعفر نے کہا کہ وہ بدعتی ہے؟ بدعتی ہے؟ قتل کیا جائیگا جس نے کہا کہ ابوبکر و عمر ہدایت کے امام نہ تھے قتل کیا جائے گا۔ قتل کیا جائیگا۔

سب سے پہلے تو یہی معلوم کرنا ہے کہ ابن عساکر جن کی ولادت ۴۹۹ھ میں اور وفات ۵۷۱ھ میں ہوئی۔ اور ابن الامام کی ولادت ۲۱۰ھ میں اور وفات ۳۵۰ھ میں ہوئی۔ تو ابن الامام کی وفات کے اکیانویں برس کے بعد ابن عساکر پیدا ہوئے تھے، اس لئے جب تک ابن عساکر اور ابن الامام کے درمیان کا راوی معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس روایت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟

مگر میرے خیال میں یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس عبارت ہی میں شیعیت کی پوری شان نمایاں ہے۔ شیعہ حضرات کا یہ دستور ہے کہ اپنے اصول تقیہ و کتمان کے ماتحت اکثر دو پہلو باتیں ضرورت کے وقت کرتے ہیں۔ اور ایسی باتیں غالباً وہ پہلے سے سوچے ہوئے رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑی تو یوں بولیں گے جس کی متعدد مثالیں شیعہ علماء و مصنفین کے اقوال میں ملتی ہیں۔ چنانچہ اسی عبارت کے وقف و وصل کو ذرا بدل کر یوں پڑھیے۔ فقال ابو جعفر من قال ان ابا بکر و عمر لیسا باما می ھدیٰ الیش ھو؟ فقال لہ ابن الامام مبتدع۔ فقال لہ الطبری منکرا علیہ مبتدع مبتدع ھذا؟ یُقتَلُ من قال۔ ان ابا بکر و عمر لیسا باماسے ھدیٰ یُقتَل یُقتَل۔ اب اس عبارت کا ترجمہ یوں ہوا کہ ابن جریر سے ابو جعفر نے پوچھا کہ جو شخص یہ کہے کہ ابوبکر و عمر ہدایت کے امام نہیں ہیں۔ وہ کیا ہے؟ (یعنی اگر کسی نے ایسا کہا تو اس پر کیا الزام ہے؟) ابن الامام نے کہا کہ وہ بدعتی ہے تو ابن الامام سے طبری نے کہا ان کی بات کا انکار کرتے ہوئے کہ وہ بدعتی ہے؟ وہ بدعتی ہے؟ قتل کیا جائے گا جو ایسا کہے گا۔ (یعنی جو اس کو بدعتی کہے گا وہ قتل کیا جائیگا) بے شک ابوبکر و عمر ہدایت کے امام نہ تھے۔ قتل کیا جائیگا، قتل کیا جائیگا (یعنی وہ جس نے ان دونوں کے امام ہدایت ہونے سے انکار کرنے والے کو بدعتی کہا)

میں نے بریکٹ میں جو مفہوم کو واضح کرنے کے لئے عبارت بڑھائی ہے۔ وہ صرف سمجھانے کے لئے ایسا ہو کہ عام ناظرین یہ سمجھیں کہ پہلے ترجمہ میں اس طرح کے بریکٹ نہ تھے۔ اس لئے وہ ترجمہ صاف تھا، اور یہ ترجمہ زبردستی بنا لیا گیا ہے۔ اس لئے اتنے بریکٹ کی ضرورت پڑی۔ جو شخص عربی جانتا ہے اور عربی ادب سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہے۔ وہ دونوں ترجموں کے مطابق عربی عبارت کو بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے اور یہ نہیں الزام دے گا کہ بریکٹ کے زور سے قائل کے مقصود کے خلاف ایک معنی اور زبردستی نکالے جا رہے ہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ شیعہ مصنفین اپنی کتابوں میں ایسے دو پہلو الفاظ رکھ لکھتے ہیں کہ حسب تقاضہ اس کے پہلو تبدیل کئے جائیں۔ تو مناسب ہے کہ اس کی دو ایک مثال بھی پیش کر دوں ملاحظہ فرمایئے۔

شیعوں کے مشہور محدث و عالم علم رجال علامہ شیخ حلی اپنی کتاب "خلاصۃ الاقوال فی معرفۃ الرجال" کے صفحہ ۱۲۱ میں محمد بن شہاب زہری کے متعلق لکھتے ہیں من اصحاب علی بن الحسین عَدُوٌّ لَہٗ یعنی لوگوں نے ان کو حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) کے اصحاب میں شمار کیا ہے مگر آپ اس کو عَدُوٌّ لَہٗ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ تو ترجمہ یوں ہوگا کہ یہ علی بن الحسین کے اصحاب میں تھے مگر ان کے دشمن تھے۔

ابن کوفہ میں سے کسی نے حضرت علی سے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا انھما امامان عادلان قاسطان کانا علی الحق۔ یعنی وہ دونوں عادل و انصاف ور امام تھے، حق پر تھے اور حق پر مرے، یہ پوری روایت شیعوں کی قدیم کتابوں میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ "تحفۂ ہمایوں کشاف نادری" صفحہ ۲۲۵ میں بھی موجود ہے۔ مگر متاخرین شیعہ حضرات نے صرف آدھی بات اپنی کتابوں میں لکھی یعنی انھما امامان عادلان قاسطان ہی تک اور عادل کا ترجمہ کیا "حق سے عدول یعنی انحراف کرنے والا" اور قاسط کا ترجمہ کیا "ظالم" کیونکہ "عادل" جس طرح "عدل" کا اسم فاعل ہے اسی طرح "عدول" کا بھی اور "قسط" لغات اضداد سے ہے۔ اس کے معنی انصاف کے بھی اور ظلم کے بھی۔ حالانکہ "عدل و قسط" جب ساتھ آئیں گے تو ان سے "عدل و انصاف" کے ہی معنی لئے جائیں گے۔ کبھی انحراف و روگردانی و ظلم کے معنی نہیں لئے جا سکتے۔ مگر اسی معنوی تحریف کے لئے تو پوری روایت نقل نہیں کرتے۔ آدھی بات لکھتے ہیں۔

(بالکل یہی حال فرقہ شیعہ کا ہے) تاریخ بتاتی ہے کہ دور اول میں شیعہ حضرات اہل سنت کے ساتھ گھل مل کر رہے اور ہمیشہ تقیہ و کتمان کی نقاب اپنے چہروں پر ڈالے رہے۔ کبھی کبھی تفضیلِ شیخین کا راگ بھی باوازِ دہل الاپتے رہے۔ یہاں تک کہ بعض نے حضرت علیؓ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخیاں علانیہ طور سے کر کے اپنے آپ کو خارجی بھی مشہور کر لیا مگر تھے وہ درحقیقت شیعہ۔ اس لئے روایتیں ہمیشہ شیعوں کے موافق بیان کرتے رہے۔ تاکہ عوام اور ناواقف یا سادہ لوح محدثین یہ سمجھیں کہ ایک خارجی ہو کر جب یہ ایسا کہہ رہا ہے۔ تو ضرور یہ روایت سچی ہوگی۔

آپ شیعہ حضرات کی کتب احادیث کو ملاحظہ فرمائیں۔ ایک مستقل باب "باب الکتمان" آپ کو ملیگا جس میں ان کے ائمہ کی تاکید کی تصریحات موجود ہیں کہ ہر شیعہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے دین اپنے عقیدہ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھے۔ چنانچہ اصول کافی میں یہ حدیثیں موجود ہیں کہ لا تبثّوا سرّنا ولا تذیعوا امرنا۔ یعنی ہمارا راز فاش نہ کرو اور ہمارا دین شائع نہ کرو انکم علیٰ دینٍ من کتمہٗ اعزّہ اللہ ومن اذاعہٗ اذلّہ اللہ۔ تم لوگ ایسے دین پر ہو کہ جس نے اس دین کو پوشیدہ رکھا۔ اللہ تعالےٰ اس کو عزت دے گا۔ اور جو شائع کرے گا۔ اللہ تعالےٰ اس کو ذلیل کرے گا۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ ایسے لغو اقوال جو خلاف قرآن ہیں کبھی حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما، یا ان کے ابناء و احفاد رضی اللہ عنہم کے نہیں ہو سکتے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ حضرات ان احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں بہرحال جبتک ان کو سیاسی طاقت حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس وقت تک علمائے اہل سنت پر ان کا صحیح عقیدہ کبھی واضح نہ ہو سکا یہی وجہ ہے کہ ابان بن تغلب جیسے غالی شیعہ کے متعلق جس کے متشدد شیعہ ہونے کی شہادت خود شیعوں کی کتب رجال سے مل رہی ہے۔ امام ذہبی میزان الاعتدال میں کان غالیا فی التشیع اور ذائغ مجاھر لکھنے کے بعد بھی وثقہ احمد بن حنبل و ابن معین و ابو حاتم لکھتے ہیں اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مبتدع کی توثیق کیونکر جائز ہو سکتی ہے تو پھر اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بدعت صغریٰ جیسے غلو فی التشیع یا تشیع بلا غلو و بلا تحرق تو یہ اکثر تابعین میں تھا اور تبع تابعین میں باوجود ان کے دین و ورع اور صدق کے تو اگر ان سب لوگوں کی حدیثیں رد کر دی جائیں۔ تو سلسلے آثار نبویہ جاتے رہیں گے اور یہ مفسدۂ عظیمہ ہے۔ اور دوسری بدعت کبریٰ ہے مثل رفض کامل اور غلو فی الرفض کے اور حضرات شیخینؓ پر حملے، اور اس مسلک کی طرف لوگوں کو دعوت دینا۔ تو ایسی بدعت کبریٰ والوں کی سند نہیں لی جائے گی اور ان میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر آگے چل کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا سچا آدمی اس جماعت کا نہیں ہے جو کذب سے محفوظ ہو۔ بلکہ کذب ان کا شعار اور تقیہ و نفاق ان کا وطیرہ ہے۔ تو جس کا یہ حال ہو اس کا قول کیونکر قبول کیا جائے گا۔ مگر زمانہ سلف میں شیعہ غالی وہ تھا جو حضرات عثمان و طلحہ و زبیر و معاویہ رضی اللہ عنہم کی شان میں کچھ گفتگو رکھتا تھا۔ اور جن لوگوں نے حضرت علیؓ سے محاربہ کیا ان کو کچھ برا بھلا کہتا تھا۔ مگر اس زمانہ کے شیعے تو حضرات شیخینؓ سے اظہار بیزاری کرتے ہیں۔ اور حضرات عثمان و طلحہ و زبیر و معاویہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر کرتے ہیں غرض امام ذہبی آخر میں فرماتے ہیں کہ ابان بن تغلب ایسے نہ تھے۔ وہ شیخینؓ کی شان میں کچھ تعرض نہیں کرتے تھے۔ صرف حضرت علیؓ کو ان دونوں سے افضل ضرور سمجھتے تھے۔

حیرت ہے کہ امام ذہبی اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ اگر یہ لوگ مسلک کتمان کو اختیار نہ کرتے۔ تو ان سے حدیثیں کون لیتا اور کون ان کا اعتبار کرتا۔ اس لئے وہ اپنے مسلک کتمان کے مطابق ہمیشہ اپنے عقائد کو پوشیدہ ہی رکھتے رہے اور کبھی حضرات شیخینؓ کی شان میں کھلم کھلا بے موقعہ بول سکے بلکہ اپنی بے تعصبی دکھلانے کے لئے تفضیلِ شیخین کی روایتیں بھی کبھی کبھی بیان کرتے رہے۔ مثلاً عبدالرحمن بن صالح اللزدی العتکی، ابو صالح ویقال ابو محمد الکوفی جو کہا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلعم کے بعد افضل امت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ حالانکہ محترق فی التشیع تھا۔ اور اصحاب رسول اللہ صلعم کی ہجو و تنقیص میں کتاب تصنیف کر رکھی تھی اور حضرات امہات المومنین ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو و منقصت بیان کرتا تھا۔ مگر جن لوگوں کے سامنے ایسی ناشائستہ باتیں بیان کرتا تھا، اور جنھوں نے اس کی کتاب

لہ محدثین تابعین و تبع تابعین ... [illegible]

کے آثار نبویہ ... [illegible]

سے یہ امام ذہبی کی ... [illegible]

ہجو و منقصت دیکھ لی انھوں نے اس کو رجلُ سوءٍ (نہایت برا آدمی کہا) اور محترق فی التشیع کہا اور اس سے جو حدیثیں لی تھیں ان سب کو جلا دیا۔ اور جن کے سامنے یہ کتمان کرتا رہا وہ اس کو نہایت ثقہ اور سچا سمجھتے رہے۔ چنانچہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہما اس کے بڑے معتقد اور مداح تھے باوجود اس کے کہ اس کو شیعہ سمجھتے اور جانتے تھے۔

یہی حال سلیمان بن مہران الاعمش اور ابو اسحاق السبیعی اور زبید الیامی اور منصور بن معتمر وغیرہم کا ہے۔ عبداللہ بن المبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ أفسدَ حدیثَ اھل الکوفة ابو اسحٰق والاعمش ھذا، یعنی اہل کوفہ کی حدیثوں کو ابو اسحٰق نے اور تمہارے اس اعمش نے برباد کیا۔ اور قریب قریب یہی کے معن بن عیسیٰ ابو یحییٰ القزاز المدنی نے بھی کہا کہ أفسدَ حدیثَ اھل الکوفة الاعمش وابو اسحٰق ان سارے اقوال کے علاوہ تہذیب التہذیب میں یہ بھی ابن حجر نے میزان سے نقل کیا ہے کہ کان من اھل الکوفة قوم لا یحمد الناس مذاھبھم ھم رؤوس محدثی الکوفة مثل ابی اسحٰق ومنصور و زبید الیامی والاعمش وغیرھم من اقرانھم یعنی اہل کوفہ میں ایک قوم تھی جن کا مذہب لوگوں میں ناپسندیدہ تھا اور وہ محدثین کوفہ کے سرداروں میں تھے۔ مثل ابو اسحٰق اور منصور اور زبید الیامی اور اعمش کے اور ان کے سوا ان کے اقران۔ مگر باوجود ان تحریروں کے احادیث اہل سنت کے دفاتر آج انہی لوگوں کی روایتوں سے بھرے پڑے ہیں جس کی وجہ یہی ہے جس کو امام ذہبی نے لکھا کہ اگر ان لوگوں سے روایتیں نہ لیں تو پھر (بزعم الشان) آثار نبویہ کا ایک بہت بڑا حصہ جاتا رہتا ہے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب بضمن ترجمہ قتادہ بن دعامہ لکھتے ہیں کہ قال ابن المدینی یحیٰی بن سعید ان عبد الرحمٰن یقول اترک کل من کان راسًا فی البدعة یدعوا الیھا قال کیف تصنع بقتادة و ابن ابی رواد وعمر و بن ذر وذکر قومًا۔ ثم قال یحیٰی ان ترکت ھذا الضرب ترکت ناسًا کثیرًا۔ یعنی علی بن المدینی یحیٰی بن سعید سے کہنے لگے کہ عبد الرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں۔ (یہ تینوں کبار ائمہ حدیث اور اساطین جرح و تعدیل ہیں) کہ وہ شخص جو بدعت میں سردار ہو اور دوسروں کو بدعت کی طرف دعوت دے اس کو ترک کر دو تو یحیٰی بن سعید نے کہا تو پھر قتادہ اور ابن ابی رواد اور عمرو بن ذر وغیرہم (ایک جماعت کا نام لیکر کہا) ان لوگوں کے ساتھ تم کیا کرو گے؟ پھر یحیٰی بن سعید نے کہا کہ اگر اس قسم سے ہم ترک کرنے لگیں تو ایک بڑی جماعت کو ترک کر دینا پڑے گا۔" اتنی تفصیل سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ راویان حدیث میں کثرت اہل بدعت کی تھی۔ تابعین و تبع تابعین میں سے جو راویان حدیث تھے۔ ان میں متشیعین بہت تھے اور مبتدعین بے حد۔ (اور کیوں نہ ہوتے؟ منافقین عجم کی جماعت بھی تو انھیں میں ملی جلی تھی۔ اس لئے جو سچے اور مخلص تھے۔ وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے)

اتنی تصریح سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ روایتوں کے لالچ میں آکر شیعوں اور روافض کے تشیع و رفض کو نظر انداز کر کے ائمہ حدیث ان سے روایتیں لیا کرتے تھے اور یہ شیعی راویان حدیث شہد میں زہر گھول گھول کر رکھتے تھے۔ ہر دس پندرہ روایت میں سے کم سے کم ایک دو روایت ایسی ضرور ہوا کرتی تھی جس سے کوئی نہ کوئی فساد ضرور پیدا ہو۔ چاہے وہ فسادات عقائد میں ہوں یا عبادات میں اخلاق میں ہوں یا معاملات میں۔ مگر چونکہ وہ زہر شہد میں ملا ہوا ہوتا تھا۔ اس لئے شہد کی ظاہری صورت دیکھ کر بھولے بھالے شہد کے خریدار اس کو لے لیا کرتے تھے۔ انھیں اس کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس شہد میں زہر بھی ملا ہوا ہے۔ اور بعض جان بوجھ کر تاویلی تریاق کے بھروسے پر وہ زہر آلود روایتیں بھی لے لیا کرتے تھے۔ گو وہ زہر ان میں نہیں تو دوسروں میں اپنا کام کرتا رہا۔

بالکل اسی طرح ابن جریر طبری کی تفسیر ہے کہ تفسیری روایات جس کا زیادہ تر سرمایہ انھیں منافقین وکذابین و ضعفاء و متروکین اور روافض صوفیہ کے مفتریات و مکذوبات ہی سے جمع ہوا ہے۔ سب کو تقریباً انھوں نے جمع کر دیا ہے اور بقول علامہ حافظ احمد بن علی السلیمانی بطور خود بھی روافض کے موافق بیسیوں روایتیں وضع کر کے اپنی تفسیر میں درج کر دی ہیں۔ مگر اتنا بڑا ذخیرہ تفسیری روایات کا جمع کرنے والا ان سے متقدم کوئی بھی نہیں گذرا۔ اگر ابن جریر کو رافضی و وضاع تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان کی تفسیر سے ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔ اور یہ سرمایہ جس سے ہر فرقہ اپنے اپنے موافق تفسیری روایتیں لے لے کر اپنے اپنے فرقہ کی پشتیبانی کرتا رہتا ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ بس صرف اسی لئے امام ذہبی اور ابن حجر دونوں نے ان کو صرف شیعہ تک رہنے دیا۔ وہ بھی مجبوراً چونکہ اس سے انکار نہ کر سکے۔ باقی رہا رفض تو اس سے امام ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں نے سختی کے ساتھ انکار کیا کہ ابن جریر ہرگز رافضی نہ تھے۔ حالانکہ دونوں لکھتے ہیں کہ علامہ حافظ سلیمانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ابن جریر رافضیوں کے لئے جھوٹی حدیثیں وضع کیا کرتے تھے مگر ان کو نقل کرنے کے بعد بھی علامہ حافظ سلیمانی کے علم و فضل و اتقان کے تسلیم کرنے کے باوجود بھی اس الزام کو اتہام قرار دیتے ہیں۔ پھر ابن حجر کے شیخ الشیوخ ابو حیان اپنی تفسیر میں ان کو مذہب امامیہ کا ایک امام لکھتے ہیں اور انھوں نے کوئی حوالہ علامہ سلیمانی کا نہیں دیا ہے۔ مگر ابن حجر اپنے شیخ الشیوخ پر بھی رجماً بالغیب الزام دیتے ہیں کہ ان کو علامہ سلیمانی کے قول سے دھوکا ہوا جو ایسا لکھ دیا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابن جریر نے حدیث غدیر خم کی تصحیح کی۔ حالانکہ سارے ائمہ حدیث، اس کو موضوع اور من گھڑت یقین کرتے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ابن حجر نے طلاق کے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں ابن جریر نے مذہب شیعہ کے مطابق فتویٰ دیا تھا، اور حضرت علیؓ اور ان کے اہل بیت رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ایک خاص کتاب بھی لکھی تھی، غرض یہ ہے کہ طرح طرح کے ثبوت ابن جریر کے رفض کے مل رہے ہیں مگر صرف ان کی تفسیر کی خاطر ان کو فقط شیعہ تک تو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر رفض سے انکار کئے جاتے ہیں۔ اس "حمیت جاہلیہ" کا کیا جواب ہے؟

اگر واقعہ کے اعتبار سے ان کی تفسیر کو دیکھئے تو ہر اس مقام پر جہاں شیعوں نے اپنا مطلب نکالنا چاہا ہے ایک نہ ایک تفسیری روایت شیعوں کے مطابق ضرور موجود ہے، سورہ احزاب کی آیہ تطہیر کو دیکھ لیجئے، پورا رکوع اور اس کی ایک ایک آیت بزبان حال خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کے ہر جملے کی مورد امہات المومنین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مگر شیعے کہتے ہیں کہ ہاں پورا رکوع ضرور ازواج النبی صلعم کے متعلق ہے۔ اور وہ آیت جس کا آخری ٹکڑہ ہے انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ آیت بھی ازواجؓ ہی کے متعلق ہے مگر صرف اتنا ٹکڑا حضرات علیؓ و فاطمہؓ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے متعلق ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی پھر ازواج مطہراتؓ ہی کی طرف مخاطبت ہے۔ یہ قول خلاف سیاق و سباق اور خلاف عقل و درایت جس قدر ہو معمولی سی عقل و فہم والا بھی سمجھ سکتا ہے۔ مگر غلو بغیر الحق کی وجہ سے ایسی خلاف عقل بات پر خواہ مخواہ کا اصرار کیا جاتا ہے۔ شیعیان کوفہ نے اس کے لئے واقعہ کساء[1] والی روایتیں گھڑ گھڑ کر اس کی خوب خوب اشاعت کی۔ یہاں تک کہ شیعہ حضرات کے ہاں اس قسم کی روایات کا پایا جانا قابل فہم ہو۔ لیکن غور کیجئے کہ مسند احمد وغیرہ میں بھی اس کی روایتیں نظر آنے لگیں جس کا مطلب کیا ہے؟ اس موضوع پر میرا ایک مستقل مضمون تیار ہے۔ انشاء اللہ کبھی شائع ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا خلاصہ رسالہ البیان امرتسر مورخہ اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء کے دو پرچوں میں باقساط چھپ چکا ہے۔ اس لئے میں سر دست اس بحث سے قطع نظر کرتا ہوں۔ غرض مسند احمد اور ابن ابی حاتم کی کتاب میں اس واقعہ کی چند موضوع روایتیں ملتی ہیں۔ مگر تفسیر ابن جریر میں آپ دیکھ لیجئے۔ سولہ روایتیں اس واقعہ کساء کے متعلق انھوں نے ایسی ایسی درج کی ہیں۔ جن میں سے زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ ہی روایتیں ایسی ہونگی جو کسی اور کتاب میں بھی مذکور ہوں اور کم سے کم دس روایتیں تو یقیناً ایسی ہیں جو صرف امام ابن جریر کی خاص طبعزاد ہیں۔ ہرگز ہرگز وہ دوسرے کے پاس نہ ملیں گی۔ اسی طرح اور دوسرے مقامات کو بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ سلیمانی کے اس قول کی صاف تصدیق ہو جاتی ہے کہ ابن جریر شیعوں یا رافضیوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔

ذاتی ملکیت کے قرآنی تصور کے لئے
نظامِ ربوبیت
ملاحظہ کیجئے

---

[1] یہ روایتیں اپنے اختلاف مضامین و اضطراب بیانات کی وجہ سے خود ایک دوسرے کی تردید کر رہی ہیں میرا ایک مستقل رسالہ ہے "تطہیر آیۃ التطہیر من دنس صفوات اللذات فی التفسیر" میں نے اس رسالہ میں ان تمام روایات کی پوری قلعی کھول دی ہے

سنّت کی صحیح حیثیت

محترم امین احسن صاحب اصلاحی سے آپ نے ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۵۵ء میں "مسودہ قانون وضاحتِ قانونِ شریعت بابت ۱۹۵۴ء" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع فرمایا ہے۔ جس میں آپنے لکھا ہے کہ

> جس طرح اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح اسلام میں کتاب اور سنت کے درمیان کسی تفریق کی گنجائش نہیں۔ سنت سے میری مراد نبی صلعم کا ثابت شدہ طریقہ ہے۔ اسلام میں اس سے انحراف کھلا ہوا کفر ہے۔

اس میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں یہ تو آیا ہے کہ ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ کہیں نہیں آیا کہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اس کے برعکس قرآن کریم میں بصراحت مذکور ہے کہ رسول خدا کا عبد ہوتا ہے اور عبد اور معبود میں فرق نہ کرنا کھلا ہوا شرک ہے۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ آپ کے پاس یہ کہنے کی کیا سند ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی؟

(۲) آپنے فرمایا ہے کہ "سنت سے مراد نبی کا ثابت شدہ طریقہ ہے۔"

کیا آپ فرمائیں گے کہ

(ا) ثابت شدہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟

(ب) اسے کس نے ثابت کیا ہے؟

(ج) یہ ثابت شدہ طریقہ آج بہ تمام وکمال کہاں مل سکتا ہے یعنی کس کتاب میں۔ اور اس کی سند کیا ہے کہ وہ ثابت شدہ ہے؟

چونکہ یہ دین کے بڑے اہم سوالات ہیں۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ محترم اصلاحی صاحب ان کے جواب سے ضرور سرفراز فرمائیں گے تاکہ بات صاف اور واضح ہو جائے اور گمراہیاں رک جائیں۔

محترم عبدالغفار حسن صاحب سے آپ نے ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۵۵ء میں "رسائل ومسائل" کے عنوان کے ماتحت تحریر فرمایا ہے کہ

> رسول اللہ نے وحی خفی (سنت) کے ذریعے قرآن مجید کے معانی اور مصداق کو متعین فرمایا۔

لیکن محترم مودودی صاحب، تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۳۵ پر لکھتے ہیں کہ

> (اللہ نے رسول کو درمیان واسطہ اس لئے بنایا کہ) وہ اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کردیں۔ جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیئے۔

یعنی آپنے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے وحی خفی کے ذریعے ایسا کیا۔ اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ حضورؐ نے اپنی خداداد بصیرت کی روسے ایسا کیا۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ ان میں سے کونسی بات صحیح ہے؟

(۲) آپ نے لکھا ہے کہ

> رسول اللہ نے قرآنی اصول وضوابط کی روشنی میں حلال وحرام کی ایسی فہرست بھی امت کو بتائی۔ جو قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں۔

لیکن محترم مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن (جلد اول) کے صفحہ ۵۹۸ پر فرماتے ہیں کہ

> حرام وحلال اور جائز وناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

(۳) آپ نے لکھا ہے کہ

> حدیث کو بطور دینی حجت ماننے سے انکار کرنے والا منکر حدیث کہلاتا ہے۔ باقی رہا جو شخص دیانتدارانہ طور پر اپنے فہم وبصیرت سے روایات کے وسیع ذخیرے میں سے کسی ایک یا چند روایات کو اس بنا پر قبول نہیں کرتا کہ وہ اصول روایت یا اصول درایت کے خلاف ہیں تو اسے منکر حدیث نہیں کہا جاسکتا۔

"دینی حجت" کے معنی یہ ہیں کہ کسی اختلافی معاملہ میں جب وہ سند پیش کردی جائے تو اس کے بعد بات ختم ہو جائے اور کسی کو اس میں مجال انکار یا یارائے گفتگو نہ رہے۔ مثلاً اگر یہ سوال زیر بحث ہو کہ لحم خنزیر حلال ہے یا حرام۔ اور ایک شخص قرآن کی آیت پڑھ دے کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ... (۵/۳) تو یہ دینی حجت ہو جائے گی۔ اس میں کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ یہ کہدے کہ میں اپنی فہم وبصیرت کے مطابق اسے قابل قبول تسلیم نہیں کرتا۔

لیکن حدیث کے معاملہ میں آپ فرماتے ہیں کہ اس کی اجازت ہے کہ کوئی شخص یہ کہدے کہ میں اپنی فہم وبصیرت کے مطابق فلاں حدیث کو ناقابل قبول سمجھتا ہوں کیونکہ یہ فلاں فلاں اصول روایت ودرایت کے خلاف ہے۔

فرمائیے کہ اس باب میں قرآن اور حدیث میں بنیادی فرق ہوگیا یا نہیں۔ اور ایسی چیز جس میں افراد کو رد وقبول کرنے کا اختیار حاصل ہو کسی طرح بھی دینی حجت ہو سکتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جن احادیث کو اپنی فہم وبصیرت کے مطابق دیانتدارانہ طور پر قابل قبول سمجھتا ہے، وہ انھیں دینی حجت سمجھ لے۔ لیکن وہ دینی حجت صرف اس کے اپنے لئے ہو سکتی ہیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص انھیں دینی حجت نہ مانے تو اس سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوگا۔

اب فرمائیے کہ جس دینی سرمایہ کی حیثیت یہ ہو کہ اس کا کوئی ایک حصہ بعض کے نزدیک حجت ہو، اور دوسرا حصہ دوسروں کے نزدیک، اسے آپ ساری امت کے لئے متفقہ طور پر دینی حجت کس طرح قرار دیں گے؟ یعنی وہ کون سی احادیث ہونگی جن کے متعلق آپ یہ کہیں گے کہ یہ ساری کی ساری امت کے لئے دینی حجت ہیں۔ اور ایسا کہنے کے لئے آپ کے پاس کیا سند ہوگی؟

جب رسول اللہ صحابہؓ کو دین کے متعلق کوئی حکم دیتے تھے تو کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے اپنے فہم وبصیرت کی کسوٹی پر پرکھے، اور چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو (معاذ اللہ) اسے رد کردے۔ لیکن احادیث رسول اللہ کے متعلق آپ یہ حق تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک حجت دین ہونے کا تعلق ہے، رسول اللہ کے ان احکام میں جنہیں حضورؐ نے اپنے زمانہ میں نافذ فرمایا اور ان احکام کے مجموعہ میں جو آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں، ایک بنیادی فرق ہے۔ کیا جو شخص اس فرق کو تسلیم کرے وہ صحیح راستے پر ہے یا گمراہ ہے؟

کیا ہم توقع کریں کہ آپ دین کے ان اہم مسائل کے متعلق وضاحت فرما کر شکر گذاری کا موقعہ دیں گے؟

بزمِ طلوعِ اسلام

ہر شخص قدم قدم پر دیکھتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بد انتظامی بددیانتی، جھوٹ وغیرہ کا ایسا چلن ہوگیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے کام نہ لے تو وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ آئے دن کا تجربہ ہے کہ دیانتداری سے کام لینے والے ناکام ہوتے ہیں، اور جھوٹ اور بددیانتی سے کام لینے والے کامیاب ہوتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کی ان غلط بنیادوں کو بدلا نہیں جاسکتا؟ یہ سوال اکثر سوچنے والوں کو پریشان کرتا ہے۔ اور کم ایسے لوگ ہیں جو اس کے صحیح جواب تک پہونچتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اجتماعی مسئلہ کو انفرادی طریق سے سوچا جاتا ہے۔ اور جب اس کا حل ملتا نہیں اور ملتا ہے تو وہ ممکن العمل نظر نہیں آتا، تو یہ سوچنے والے بھی ادھر کو ہو لیتے ہیں جس طرف کی ہوا ہے۔ اس طرح رائج غلط اقدار مستحکم ہو جاتی ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ ان کا بدلنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

لیکن یہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب نہ ہو، اور جواب بھی وہ جو سو فیصدی ممکن العمل ہو۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کچھ مستقل اقدار ہیں جن میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی صورت میں ان کا ساتھ نہ چھوڑے لیکن ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان اقدار کو عملاً زندگی میں قائم رکھنے میں نقصان ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں اس قدر فساد

پیدا ہو جائے۔ تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اقدار مستقل کو چھوڑ کر وقتی نقصان کا مداوا کر لیا جائے۔ بلکہ ان کو پوری مضبوطی سے تھامے ہوئے ان حالات کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے، جو اس نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ جنگ تنہا نہیں لڑی جا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کی رفاقت حاصل کی جائے جو مستقل اقدار پر ایمان رکھتے ہیں (اور انہیں نقصان کے ڈر سے انہیں چھوڑ نہیں دیتے) تنہا افراد بے بس ہوں گے اور وہ بدستور نقصان اٹھاتے رہیں گے لیکن جب کئی ہم خیال متحد ہوتے جائیں گے۔ تو اس اتحاد و یکجہتی سے ان کی قوت بڑھ جائے گی اور وہ ناسا عد حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہی جماعت رفتہ رفتہ پھیلتے پھیلتے اس قابل ہو جائے گی کہ وہ معاشرے کی بنیاد مستقل اقدار پر استوار کرسکے۔ جب ایسا ہو گا ....

... تو پھر مستقل اقدار کے خلاف جانے والے نقصان اٹھائیں گے۔

اس نکتہ کو خاص طور پر سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ایک فرد اپنے دل میں کتنا ہی اطمینان اور سکون کیوں نہ پیدا کرلے وہ جنتی زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ جنتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایسا فرد اسی قسم کے افراد کے زمرے میں داخل ہو جائے۔ قرآن نے نفس مطمئنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (۲۹-۳۰/۸۹) تو خدا کے بندوں کی جماعت میں داخل ہو اور اس طرح جنت میں داخل ہو: جنتی زندگی کے لئے خدا کی بندوں کی جماعت میں شمولیت شرط اول ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ افراد ہم خیال افراد سے مل کر خداوندی معاشرہ کی تشکیل کی کوشش کریں۔

بزم طلوع اسلام کا مقصود و منشا یہی ہے کہ قرآنی فکر سے متمسک افراد انفرادی طور پر نقصان اٹھاتے رہنے کی بجائے باہم اکٹھے ہو جائیں، اس فکر کو پھیلا پھیلا کر ہم خیال جمع کرتے جائیں۔ اور اس طرح نئے قرآنی معاشرے کی طرح ڈالیں۔

آپ عرصے سے طلوع اسلام پڑھ رہے ہیں اور اس کے ہم خیال ہیں۔ آپ کے گاؤں، آپ کے شہر میں اور لوگ بھی ہونگے جو اسی طرح طلوع اسلام کے ہم خیال ہوں گے۔ ان سے ملئے۔ مل بیٹھئے۔ اور سوچئے کہ آپ اس فکر کو کیسے آگے بڑھا سکتے ہیں اگر ایسے ہم خیال آپ کے آس پاس موجود نہیں ہیں تو ایسے لوگ تو یقیناً ملیں گے کہ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ موجودہ معاشرتی عذاب سے بچنے کے لئے یہ صورت ہے جو طلوع اسلام پیش کر رہا ہے، تو وہ آپ کا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ کے ہم خیالوں کا سلسلہ پیدا ہو جائے گا۔ یہی حلقہ بزم طلوع اسلام کہلائے گا اور ایسی بزمیں مل کر وہ معاشرہ قائم کریں گی جو افراد کے لئے جنتی زندگی کا ضامن ہو گا۔ اٹھئے۔ آس پاس کا جائزہ لیجئے اور بزم طلوع اسلام کی تشکیل کی کوشش شروع کر دیجئے۔

واہ چھاؤنی محمد اسحٰق خاں صاحب کوارٹر نمبر ۴۲۱ / ۱۰ / ۴ واہ چھاؤنی بزم کی تشکیل میں کوشاں ہیں۔ مقامی قارئین ان سے رابطہ پیدا کریں اور بزم کی تشکیل میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

نقد و نظر

سید احمد شہیدؒ مرتبہ محترم غلام رسول صاحب مہرؔ شائع کردہ کتاب منزل لاہور

جلد اول ضخامت ۴۳۹ صفحات، جلد دوم صفحات ۴۰۸ دونوں جلدیں یکجا مجلد۔ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد ۱۲ روپے۔

اقبال نے طرابلس کی ایک مجاہدہ بچی کے ایک جانفروشانہ کارنامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے صد حیرت و تعجب سے کہا تھا کہ

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

یہ تو ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس کا ذکر ہے اور واقعہ بھی انفرادی لیکن اگر ہم پچھلی صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے آتش کدہ ہمہ تن خاکستر کو دیکھیں تو اس میں ہمیں ایک ایسی برق در آغوش "چنگاری" ملتی ہے جو ولولۂ جہاد سے شہاب ثاقب بن کر اٹھی۔ باطل کے خرمن خار وخس پر برق خاطف بن کر گری۔ لیکن خود اپنوں کی ملت فروشیوں کے صدقے شعلۂ مستعجل کی طرح ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئی۔ یہ ہمہ تن سوز چنگاری تھی، مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ کی جن کے جذبۂ جہاد نے بتایا کہ ایک مرد مومن کا یقین کامل اور ایمان محکم نہایت بے سروسامانی کے عالم میں بھی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ حضرت سید احمد کی زندگی اور ان کی تحریک جہاد کی تفصیلات قوم کی نگاہوں سے اوجھل تھیں کہ ۱۹۳۹ء میں سید ابوالحسن صاحب ندوی نے سیرت شہید کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب پر طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۳۹ء میں سیر حاصل تبصرہ ہو چکا ہے۔ جس میں کتاب کے مندرجات کے علاوہ خود اس حیات پرور تحریک کا بھی تعارف کرایا گیا تھا۔ لیکن وہ کتاب بہت مختصر تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی صاحب فکر و نظر اس پر تحقیق کا کام کرے اور اس تصویر کے مختلف گوشوں کو تفصیل سے سامنے لائے۔ اس کے بعد ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی اور اطمینان ہوا کہ محترم غلام رسول صاحب مہرؔ (وہی زمیندار اور انقلاب والے مہر۔ یا یوں کہئے کہ غالب والے مہر صاحب) اس پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ مہر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جس کام کے پیچھے لگتے ہیں نہایت صبر، برداشت، ضبط اور خاموشی سے اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے اس میں شبہ نہیں کہ ہماری بے تابی کنا شکوہ سنج تھی کہ مہر صاحب اس تحقیق کی تکمیل میں اتنی تاخیر کیوں کر رہے ہیں۔ لیکن ان بے تابیوں سے وہ صبر طلبی عشق کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ چودہ پندرہ برس کی دیدہ ریزی کے بعد مہر صاحب اس داستانِ روح پرور و حیات بخش کو باہمہ اطناب و تفصیل جمع کرنے (اور ہماری طرح ہزارہا منتظرین کے لئے) وجہ شادابی قلب و نظر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم محترم مہر صاحب کی خدمت میں ان کی اس قابل رشک کامیابی پر دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کتاب منزل کو بھی درخور مبارکباد سمجھتے ہیں جنہوں نے اتنی ضخیم کتاب کو شائع کرنے کی ہمت کرلی۔ اگرچہ جی چاہتا تھا کہ یہ کتاب اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہوتی لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس ملک میں اعلیٰ پیمانے پر شائع شدہ کتابوں کی قیمت دینے والے بہت کم ہیں۔ ہم ان تمام صاحب ذوق حضرات سے جو اپنے داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے متمنی ہیں پرزور سفارش کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو اس سرگزشت ایمان و عمل کے مطالعہ سے محروم نہ رکھیں۔

مرقع چغتائی قریب پچیس سال ادھر کا ذکر ہے کہ مصور مشرق محترم عبدالرحمٰن صاحب چغتائی نے "مرقع چغتائی" کے نام سے دیوان غالب کا مصور ایڈیشن شائع کیا جس نے مشرق و مغرب دونوں میں دیدہ ور نگاہوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہ نادر مرقع ایک عرصے سے نایاب تھا۔ بلکے چغتائی صاحب نے ہمت کی اور اسے دوبارہ اسی آب و تاب سے پھر شائع کر دیا اس دور میں جبکہ متاعِ ذوق کا افلاس قدم قدم پر نمایاں نظر آ رہا ہے اس قسم کا اقدام فی الحقیقت ہمت طلب تھا اور اس پر وہی جذبہ جنون آمادہ کر سکتا تھا جو ایک حقیقی فن کار کو اپنے فن کی گہرائیوں میں جذب رکھتا ہے اور اسے اس جہانِ سود و زیاں سے دور لے جاتا ہے۔ قیمت اس مرقع کی صرف پچیس روپے ہے اور (غالباً خود چغتائی صاحب سے (شیش محل، راوی روڈ، لاہور کے پتہ سے) مل سکتا ہے۔

جہاں تک چغتائی صاحب کے فن کا تعلق ہے ہمیں بھی حضرت علامہ اقبال کی ہمنوائی میں کہنا پڑتا ہے کہ "بدقسمتی سے میں اس مرقع پر فنی استعداد کا اہل نہیں ہوں"۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ جس مجموعہ میں غالب کا کلام، چغتائی کی قلمکاری اور اقبال کا تعارف یکجا موجود ہو۔ لہٰذا اے سوز و ساز اور جہانِ رنگ و لطف میں اس سے زیادہ حسین امتزاج شاید کہیں اور مل سکے۔

یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ نادر روزگار ہستیوں کو دنیا میں ہمیشہ قبل از وقت بھیجدیتی ہے، اس سے ہوتا یہ ہے کہ ناسا عدتِ زمانہ کے خونخوار ہاتھ ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور اسے کہیں سو دو سو سال بعد جاکر اس کا احساس ہوتا ہے کہ میں نے کیا کر دیا؟ غالب یہ کہتا ہوا مر گیا کہ "قدر سخن من۔ بہ گیتی بعد من خواہد شدن" اور آج سو سال کے بعد جاکر معلوم ہوا کہ وہ کس قدر سچ کہتا تھا۔ اقبال یہ کہتا ہوا یہاں سے رخصت ہو گیا کہ "غریبم در میانِ محفلِ خویش" اور ابھی شاید سو برس اور لگیں جب دنیا کو معلوم ہو کہ یہ غریب شہر کیا کیا سخنہائے گفتنی کہہ گیا ہے۔ یہی صورت غریب چغتائی کی ہے۔ لیکن کہیں یہ بھی تو حقیقت نہیں کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہوتی ہی ناسا عدت حالات میں ہے؟ اُف کتنی بڑی قیمت ہے جو فطرت قلب و نظر کی گہرائیاں عطا کرکے، انسان سے وصول کرتی ہے اور حقیقت شناس انسان ہے کہ وہ اس سودے کو بھی بہت سستا سمجھتا ہے۔ یہیں فطرت کو انسان کے ہاتھوں شکست ملتی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

بین الاقوامی جائزہ

بین الاقوامی توجہ بہت حد تک بندونگ میں منعقد ہونیوالی ایشیائی افریقی کانفرنس پر مرکوز رہی۔ اس کانفرنس میں پانچ کولمبو ممالک کے علاوہ جو داعیان کانفرنس تھے ۲۴ دیگر ممالک ایشیاء افریقہ شریک ہوئے۔ ترکیب و ہیئت کے اعتبار سے یہ کانفرنس بھان متی کا کنبہ تھی۔ اس میں شریک ہونے والے کسی واضح متفق علیہ مقصد کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے۔ یہ دراصل چال تھی پنڈت نہرو کی۔ وہ ایک طرف سرخ چین کو ایک عظیم بین الاقوامی اجتماع میں لا بٹھانا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اقوام سے متعارف ہو جائے۔ اور دوسری طرف دنیا بھر کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ چین سے عالمگیر امن کو کوئی خطرہ نہیں اور اگر ہو بھی تو وہ خود ثالثی کر کے معاملے کرانے کے لئے تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے" اور "استعماریت مردہ باد" کے نعرے خصوصیت سے بلند کئے جانے لگے۔ ہندوستان ان نعروں کے ذریعے ایشیائی اور افریقی اقوام کو اپنا ہم نوا بنانا چاہتے تھے۔ اور اس ہمنوائی کی مدد سے اقوام مغرب کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔

اتفاق کی بات کہ پنڈت جی کا سارا کھیل بگڑ گیا۔ کیونکہ پاکستان، ترکی، لیبیا، عراق، فلپائن، تھائی لینڈ، سیلون وغیرہ ممالک کی مساعی اور تعاون سے استعماریت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا مسئلہ بھی لا کھڑا کر دیا گیا۔ اور فضا ایسی پیدا ہوگئی کہ پنڈت جی کی خواہش اور کوشش کے باوصف، اس کی بھی مذمت کی گئی۔ اس سے پنڈت نہرو بڑے برافروختہ ہوئے۔ لیکن وہ کانفرنس کو متاثر کرنے میں ناکام رہے۔ چین کے وزیر اعظم چو این لائی نے البتہ اس صورت حال سے اپنا پینترا بدلا اور ہم تن ملائمت بن کر شرکائے کانفرنس کو یقین دلایا کہ ان کے عزائم امن پسندانہ ہیں۔ اور ہر چند انھوں نے اپنے مسائل کو کمیونزم سے حل کیا ہے۔ وہ اسے دوسروں پر مسلط نہیں کریں گے۔ ان کی بردباری اور شیریں گفتار کا اثر ایک حد تک ہوا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اثر دیرپا ثابت نہیں ہوا کیونکہ اکثر ممالک نے بعد میں یہ شبہ کا اظہار کیا کہ چین دوسرے ممالک میں مداخلت سے باز نہیں آئے گا، اور اشتراکیت کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس کانفرنس نے ہر قوم کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا کہ وہ علاقائی دفاعی تنظیمیں قائم کر سکتی ہیں۔

چین نے جہاں میٹھی میٹھی باتیں کیں، وہاں یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ فارموسا سے متعلق امریکہ سے براہ راست گفتگو کے لئے تیار ہے۔ فارموسا سے متعلق تعطل پیدا ہو گیا تھا، اسے اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا۔ تو چین نے اس سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا روس نے ایک دس قومی کانفرنس کی تجویز پیش کی لیکن اسے امریکہ نے مسترد کر دیا تھا۔ کیونکہ اس میں نیشنلسٹ چین نہیں تھا۔ اب چین کی تجویز سے یہ امید ہو چلی ہے کہ شاید باہمی مذاکرات سے جنگ تک نوبت نہ آئے۔ امریکہ میں اس کا خیر مقدم ہوا ہے۔ اور مسٹر ڈلز وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی نگرانی میں مذاکرات پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔

عالم اسلامی

بندونگ میں ایشیائی افریقی کانفرنس کے سلسلہ میں جو ممالک اسلامیہ جمع ہوئے۔ وہ آپس میں بہ حیثیت مسلمانوں کے تو نہیں ملے لیکن ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ نتیجہ تو ضرور نکلا ہے۔ مصر کے کرنل ناصر صاحب نے دیکھا کہ جب فلسطین کا مسئلہ پیش ہوا۔ تو ترکی اور پاکستان پوری طرح ان کے موید تھے لیکن ہندوستان جس کا وہ ساتھ دیتے چلے آئے ہیں۔ ان کا ہم نوا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ناصر صاحب کا دل پنڈت نہرو کی طرف سے قدرے کھٹا ہو گیا ہے۔

اس کانفرنس نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ ہر ملک اپنے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق علاقائی دفاعی تنظیمیں بنانے میں آزاد ہے۔ گویا پاکستان، ترکی، اور عراق سے معاہدہ کرنا اور دیگر ممالک عربیہ کو اس میں شرکت کی دعوت دینا، کانفرنس کے نزدیک متفقہ طور پر جائز ہے۔ اگر کرنل ناصر اسے ٹھنڈے دل سے سوچیں تو اب ان کے پاس اس معاہدے کی مذمت کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ انھوں نے بندونگ میں دیکھ لیا ہے کہ پاکستان ان کا پوری طرح ہمنوا ہے۔ اسی طرح ترکی بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسرائیلی جارحیت میں ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ ان حالات میں مصر اور ممالک عربیہ کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ ایک ہی معاہدے میں منسلک ہو جائیں۔ اور کسی نئی تنظیم کے فریب میں آکر وحدت اسلامی کو نقصان نہ پہنچائیں۔

امریکہ البتہ جھجکتا ہے کیونکہ وہ یہ ضمانت چاہتا ہے کہ چین واقعی صلح کی مخلصانہ خواہش رکھتا ہے۔ اس کے جاسوسوں کی اطلاع یہ ہے کہ چین فارموسا پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اور امن کی باتیں اس لئے کر رہا ہے کہ فریق مخالف دھوکہ میں مبتلا ہو کر غافل ہو جائے۔

چین کی طرح روس بھی دنیا کو امن پسندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ حال ہی میں آسٹریا کے چانسلر راب کو ماسکو بلا کر معاہدہ امن کا چکر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اقوام مغرب کو دعوت دی کہ وہ اس معاہدے سے متعلق وی آنا میں کانفرنس منعقد کریں۔ یہ کوشش دراصل اس لئے کی گئی ہے کہ مغربی جرمنی اب بھی اقوام مغرب سے پوری طرح دل سکے۔ چنانچہ مغربی جرمنی میں ایک حد تک یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ شاید روس کی پالیسی بدل گئی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ جرمنی کی وحدت کی شکل پیدا ہو جائے۔ روس نے اب تک سر توڑ کوشش کی ہے کہ اقوام مغرب معاہدات پیرس کی تصدیق نہ کریں۔ اس نے انگلستان اور فرانس کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر تصدیق کی گئی تو وہ ان سے اپنے معاہدے فسخ کر دے گا۔ لیکن اب اس کا رویہ الٹ ہو گیا ہے؟ اور تصدیق کے باوجود وہ دول اربعہ کے وزرائے خارجہ کی ملاقات کی کوشش کر رہا ہے۔ مارشل بلگانن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ صدر آئزن ہاور اور وزیر اعظم ایڈن سے ملنے کے لئے تیار ہیں۔ امریکہ اس فریب میں آنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کا موقف یہ ہے کہ پہلے ان ممالک کے سفیر آپس میں ملیں اور پھر وزرائے خارجہ۔

کرنل ناصر صاحب کے خیالات میں تبدیلی کے آثار ضرور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی یہ کہا کہ مسلمان آخر مسلمان ہیں اور وہ بہر حال ایک دوسرے کے قریب ہیں، یہ اعتراف خوش آئند ہے۔ شاید اسی کی بدولت کرنل ناصر صاحب نے یہ پیشکش کی ہے کہ وہ افغانستان اور پاکستان کے مابین مصالحت کرانے کے لئے تیار ہیں۔ حالانکہ اس سے پیشتر جس طرح افغانستان اور وہ ہندوستان کے ہمنوا تھے، وہ اسے نظر انداز کر جاتے۔ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ افغانستان کے تین روز کے قیام میں اس موضوع پر کابل کے حکمرانوں سے بات کر بھی آئے ہیں۔

اس ہفتے شام اور سعودی عربیہ کے وزرائے خارجہ پاکستان آئے ہیں۔ یہ ہر دو حضرات بندونگ کانفرنس میں شریک تھے۔ ان کا پاکستان آنا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتا ہے اگر انھوں نے بھی مصر کی طرح بندونگ کانفرنس کا شاہدہ آنکھیں کھول کر کیا ہے تو وہ بھی یقیناً اسی نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ ان کا فائدہ مسلمانوں سے ملنے میں ہے اور ترکی اور پاکستان ممالک اسلامیہ کو متحد کرنے کی جو عملی کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ مخلصانہ ہیں۔

ایران میں وزارت بدل چکی ہے۔ اب جنرل زاہدی کی بجائے مسٹر اعلیٰ وزیر اعظم بنے ہیں۔ یہ تبدیلی ایران کے مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں شرکت سے متعلق بتائی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نئے وزیر اعظم پاکستان اور ترکی کے معاہدے کے پر جوش حامی ہیں۔

یہ آثار بڑے خوش آئند ہیں۔ اگر قائدین عالم اسلامی ذرا عقل و ہوش سے کام لیں۔ تو ممالک اسلامیہ کا ایک بلاک آن واحد میں قائم ہو سکتا ہے۔ ایسا ہو جائے تو تاریخ اسلامی میں ایک باب کا افتتاح ہوگا۔

مسلمانوں کی گاڑی کے صراط مستقیم سے اتر جانے کا نتیجہ ہے کہ ہمیں انھیں متحد کرنے کے لئے اس قدر اپیلیں کرنی پڑ رہی ہیں۔ ورنہ جس اسلام نے "الف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" کے اعلان سے ایک رشتہ مواخات میں منسلک کر دیا تھا اگر یہ اسی اسلام سے وابستہ رہتے تو اس کا کوئی تصور بھی کر سکتا تھا کہ یہ الگ الگ ہوتے؟ کبھی ایک آئیڈیالوجی کے حامل الگ الگ بھی ہوا کرتے ہیں! لیکن یہاں مصیبت یہ ہے کہ اسلام کو چند رسمیات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور اس کی آئیڈیالوجی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس کا علاج اس آئیڈیالوجی کو پھر سے سامنے لانا ہے۔ اور یہ آئیڈیالوجی قرآن کو سامنے لانے ہی سے سامنے آسکتی ہے۔

(لمعہ ونظر ص ۱۵ سے آگے)

کلیات ولی

(طبع سوم) مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نمبرا
ضخامت ۳۸۲ صفحات، قیمت پانچ روپے۔

ولی دکن کا قدیم ترین اردو شاعر ہے۔ اس کا مجموعہ کلام کلیات ولی سب سے پہلے ۱۲۴۹ھ میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی کے اہتمام سے پیرس میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۲۹۱ھ میں مطبع حیدری نے، ۱۳۱۴ھ میں منشی نول کشور نے لکھنؤ سے اور ۱۳۱۴ھ میں حیدر سایانی نے پونا سے اور آخر میں ۱۳۴۵ھ مولانا احسن مارہروی مرحوم نے بڑی تحقیق و تفتیش اور طویل مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی طرف سے شائع کرایا۔ مولانا احسن مارہروی کے مرتبہ دیوان کا دوسرا اڈیشن انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب سے ۱۹۴۵ء میں مزید اضافہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کرا کے دہلی سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو قیامت برپا ہوئی اس میں مسلمانوں کی جان و مال کی تباہی کے ساتھ ساتھ دوسرے کتب خانوں کی طرح انجمن ترقی اردو کا قیمتی اور نادر کتب خانہ بھی لٹیروں کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا اور انجمن کے مطبوعہ اور قلمی نسخے بھی ضائع ہو گئے۔ جس میں کلیات ولی طبع دوم کے نسخے بھی شامل تھے۔ اب انجمن ترقی اردو پاکستان نے کلیات ولی کا تیسرا ایڈیشن ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ تیسرے ایڈیشن کے مرتب بھی ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ہیں۔ زیر نظر ایڈیشن پہلے دونوں ایڈیشنوں سے زیادہ کارآمد اور قابل اعتماد ہے۔ اس کی صحت اور صحیح ترتیب و تدوین کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس میں ولی دکنی کی انھیں غزلوں فردیات، رباعیات، مخمسات، مستزاد، قصائد، ترجیع بند، مثنویات اور قطعات کو شامل کیا گیا ہے، جن کے متعلق مرتب نے اچھی طرح چھان بین کر لی ہے۔ اور اس کا مقابلہ دوسرے قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے کر لیا ہے۔ اس اڈیشن میں ضمیمے کے طور پر ایسی غزلوں کو شامل کر دیا گیا ہے جو صرف کسی ایک نسخے میں ملتی ہیں۔ کتاب کے آخر میں متروک اور غریب الفاظ کی ایک فرہنگ شامل کر دی گئی ہے، جس سے ایڈیشن کی افادیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ولی کے حالات زندگی پر مرتب کا مضمون کافی معلومات افزا ہے۔

چونکہ قوموں کا لٹریچر ان کی ملی حیات (اور موت) کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا تحفظ اس مقصد کے لئے بڑا مفید ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں دیکھ سکیں کہ ہمارے اسلاف کن وادیوں سے گذرے ہیں۔ اور ان کے سفر زندگی کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ اس اعتبار سے انجمن ترقی اردو کے اس قسم کے اقدام حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

باب المراسلات

(ص سے آگے)

کر دی گئی تھی، اہم مستفسر اور دیگر قارئین کی توجہ ہر فروری ۱۹۵۵ء کی اشاعت کے باب المراسلات کی طرف منعطف کرا چکے ہیں۔ اور یہ چیز صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں، ہم خود مقام سنت کے متعلق اپنے مسلک کو اس وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ اس کے بعد متلاشیان حقیقت کے لئے کسی شبہ یا ابہام کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے لئے ہر اپریل ۱۹۵۵ء کے لمعات ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے بعد آپ خود سمجھ لیجئے کہ جماعت اسلامی اور ان کے ہمنوا طلوع اسلام یا محترم پرویز صاحب کے متعلق جو کچھ کہتے رہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے؟

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولائتی گلیز کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔
قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات
قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات
قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں
۱۸۴ صفحات — قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۵ صفحات۔
قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روز مرہ کی زندگی کے سامنے اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۸ صفحات
قیمت چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۴۸ صفحات
قیمت۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سچی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں۔ اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول اور مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۴ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے۔

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶
قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے۔

نظام ربوبیت — (از پرویز) انسان کے معاشی مسئلہ کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت ساڑھے سات سو صفحے۔ قیمت قسم اول چھ روپے۔ قسم دوم چار روپے۔

اقبال و قرآن — (از پرویز) علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶
قیمت دو روپے

نوٹ:- تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۳ - کراچی

سُنت رسُول اللہؐ

۳۰ اپریل کے طلوع اسلام میں عنوانِ بالا پر ایک مبسوط مقالۂ افتتاحیہ شائع کیا گیا تھا جس میں سنتِ نبی اکرم صلعم کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک واضح کرنے کے بعد، ملک کے تمام ذمہ دار افراد اور اداروں سے گزارش کی گئی تھی کہ اگر وہ اس مسلک میں کوئی غلطی دیکھیں تو ہمیں اس سے مطلع فرمائیں۔ ان میں جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے خاص طور پر خطاب کیا گیا تھا اور محترم امین احسن اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کو الگ خطوط بھی لکھے گئے تھے۔ اس وقت تک نہ اِن حضرات کی طرف سے اور نہ ہی کسی اور صاحب کی طرف سے ہمیں کوئی جواب موصول ہوا ہے، لیکن طلوع اسلام کے خلاف گالیوں کا جو سلسلہ ان حضرات نے ایک عرصہ سے شروع کر رکھا ہے وہ برابر جاری ہے۔

چونکہ دین میں سُنت رسول اللہ صلعم کے سوال کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے گذارش کریں گے کہ وہ ان حضرات سے کہیں کہ وہ اس اہم موضوع پر علمی انداز سے گفتگو کریں اور جو کچھ طلوع اسلام نے لکھا ہے اس کا جواب عنایت فرمائیں تاکہ یہ اہم اور بنیادی مسئلہ واضح اور صاف ہو جائے۔

اردو اسٹینو گرافر کی ضرورت

طلوع اسلام کے لئے ایک اچھے اردو اسٹینو گرافر کی ضرورت ہے۔

تنخواہ اور تقرری کا فیصلہ ٹیسٹ کے بعد ہوگا ضرورت مند حضرات فی الفور ناظم ادارہ سے ملاقات کریں۔

بیرونی حضرات کو اپنے خرچ پر ٹیسٹ کے لئے کراچی آنا ہوگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کراچی

عورت کا قرآن

ہمیں افسوس ہے کہ "عورت کا قرآن" اس اشاعت میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ اس کی بارھویں قسط آئندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی۔

مدیر

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ

۴۰۰ صفحات　　　قیمت چار روپے

سُنت رسُول اللہؐ (پمفلٹ)

طلوع اسلام کی ۳۰ اپریل کی اشاعت میں جو دو مقالے "سنت رسول اللہ" اور "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" شائع ہوئے تھے۔ انہیں بزم ہائے طلوع اسلام کے تقاضے پر ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے (ان میں ایک مضمون "دین خداوندی" بھی شامل کر دیا گیا ہے)۔ اس پمفلٹ کی ضخامت ۴۸ صفحات ہوگی۔ اور محض لاگت پوری کرنے کے لئے اس کی قیمت فی نسخہ ۶ آنے رکھی گئی ہے۔ بزمیں اور دیگر خواہشمند حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔

ترجمان بزم طلوع اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳
کراچی

سو برس پہلے

اپنی دولت خفیہ مقامات پر دفن کرنے کی غیر مفید حرکت سو سال پہلے بہت عام تھی جدید دنیا کی بہت سی دوسری آسائشوں کی طرح مفید طور پر روپیہ لگانے کی سہولتیں مہیا نہ تھیں۔

اس وقت ڈاکخانہ کا سیونگز بینک آپ کو اس بات کی جملہ آسانیاں فراہم کرتا ہے کہ آپ اپنا روپیہ محفوظ طور پر جمع رکھ سکیں اور اس پر معقول منافع حاصل کرتے رہیں۔

- رقم بالکل محفوظ
- روپیہ جمع کرنے کا طریقہ سہل اور سادہ
- کھاتے کا ایک جگہ سے دوسری جگہ مفت تبادلہ۔
- نفع پر انکم ٹیکس معاف
- روپیہ نکالنے کی سہولت
- اچھا منافع جس کی شرحیں ۱½ فیصدی سے ۳ فیصدی تک ہیں۔

مختلف قسم کے کھاتے مہیا ہیں۔

معمولی کھاتہ ــ مشترکہ کھاتہ ــ میعادی کھاتہ

تمام پاکستان میں ۳،۵۰۰ سے زائد شاخیں پھیلی ہوئی ہیں

پوسٹ آفس سیونگز بینک

میں روپیہ جمع کیجئے

UNITEL　　　SFP 7/55 (8)

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ — کراچی — ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

✡ نظام ربوبیت ✡

(از - پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔ رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش۔ چھہ روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے

دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔ جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں قسم اول از خود بھیجدی جائیگی۔ اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں یا قسم دوم لینا چاہیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ - کراچی-۳

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۱۵	کراچی : ہفتہ ۱۴ - مئی ۱۹۵۵ء	قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

قران نے کہا ہے کہ دین میں فرقے پیدا کرلینا شرک ہے۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس نے رسول اللہ سے کہدیا کہ۔ ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعالست منھم فی شئی (۶/۱۶۰)۔ جو لوگ اپنے دین میں فرقے پیدا کرلیں اور خود بھی ایک گروہ بنکر بیٹھ جائیں، تمہارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ وہ تمہاری امت سے خارج ہیں۔ ان کا دین کوئی اور ہے۔ ان سے تمہیں کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ خدا کا عذاب ہے ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء ھم البینت اولئک لھم عذاب عظیم (۳/۱۰۴) دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے فرقہ بندی پیدا کرلی اور کھلی کھلی تعلیم آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔ یہ ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلینا ہے۔ اکفرتم بعد ایمانکم (۳/۱۰۵) ان سے پوچھا جائیگا کہ کیا تم نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کرلیا تھا؟

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل کا حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے راہنمائی کے لئے اس وحی کی ضرورت ہے جس سے ... روشنی ملے۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی کی راہنمائی کے لئے یہی ... ضابطہ ہے۔

۳ حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو بات قرآن کے خلاف ہو ... غلط ہے۔

۴ حضور نبی اکرم انسانی بصیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر ... اس لئے ہمارے لئے ... تاریخ ... ہیں۔ ...

۵ قرآن کی رو سے دین ... ایک عالمگیر برادری کے قیام ... نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶ اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل ... ہے کہ ... انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں ... قوانین ... کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے ... اصول ... غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام ... معاشرہ کی تشکیل ... ہر کوئی ... معاشرہ ... تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸ ربوبیت عالمینا کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے ... انسانوں کی پرورش کے لئے ... کھلے رہیں ... تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

اسلامی پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں ... قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے ... تاکہ ... انسان ... اپنی ... صلاحیتوں کی ... نشوونما ... "اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ اندیشہ ہائے دور و دراز ★ عدالت کا فیصلہ ★ مودودی صاحب کی خدمت میں ★ حکومت وضاحت کرے ★ قومی گیت

★ مسئلہ کشمیر ★ آزاد عراق ★ تاریخی شواھد ★ اسلام کی سرگزشت ★ مجلس اقبال ★ عورت کا قران

★ [illegible] ★ [illegible] ★ ... الاقوامی جائزہ ★ بزم طلوع اسلام

طاہرہ کے نام

تازہ پیشکش

☆ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ـ کراچی ـ ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار
طلوعِ اسلام

جلد ۸ | ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء | نمبر ۱۵

اندیشہ ہائے دُور و دراز

تو مپندار کہ ایں قصہ بخود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

پچھلے دنوں سے پاکستان جس آئینی خلفشار کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کے متعدد پہلو ہیں۔ ان میں سے بیشتر پہلو تو ایسے ہیں جن کے متعلق اس وقت تک لب کشائی نہیں کی جا سکتی جب تک اس معاملہ کا عدالت عالیہ سے آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس وقت تک اس اہم مسئلہ کے متعلق تفصیلی طور پر کچھ نہیں لکھا حالانکہ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ اس قدر دور رس عواقب کا حامل ہے کہ اسے جذبات اور انفرادی مفاد پرستیوں سے الگ ہٹ کر خالص حقیقت شناسی اور معاملہ فہمی کے آئینہ سے دیکھنا اور سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس حدیث الم انگیز و ماجرائے جگر خراش کا ایک گوشہ ایسا ہے جس کے متعلق بلا توقف کچھ کہا جا سکتا ہے اور یہی وہ گوشہ ہے جو صحبت امروزہ کا موضوع سخن ہے۔

پہلے چند الفاظ میں یہ دیکھئے کہ اس آئینی خلفشار اور قانونی بحران کی اصل بنیاد کیا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک قانونی الجھن کی عقدہ کشائی کے ضمن میں فیڈرل کورٹ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ پاکستان کی مجلس آئین ساز نے جس قدر قوانین پاس کئے تھے، آئینی تقاضوں کی رُو سے اُن کے لئے گورنر جنرل کی تصویب کی ضرورت تھی۔ چونکہ ان قوانین کو گورنر جنرل کی تصویب حاصل نہیں ہوئی اس لئے وہ قوانین ملک کے قوانین ہی نہیں تھے۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہوا کہ گذشتہ سات آٹھ سال میں ملک میں جس قدر قوانین نافذ ہوئے، اس ٹکنیکل سقم کی وجہ سے وہ، آئینی میزان میں قانون کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا اس تمام دوران میں ملک میں بے آئینی اور لاقانونی کا عمل دور آمد رہا۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ محض قانون کا ایک اصطلاحی سقم تھا۔ اسے بلا کسی شور و شغب اور ہیجان طوفان کے کس طرح دُور کیا جا سکتا تھا۔ اس کے متعلق ہم اُس وقت لکھیں گے جب اس مسئلہ کے متعدد گوشوں پر مجموعی طور پر تبصرہ کیا جائیگا۔ سردست صرف اتنا دیکھئے کہ اس سات سال میں یہ نہیں ہوا کہ ملک میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی، باضابطہ عدالتیں نہیں تھیں، عدالتوں نے قاعدے اور قانون کے مطابق مقدمات کی سماعت اور ان کے فیصلے نہیں کئے تھے۔ ملزمین کے جرم ثابت نہیں ہوئے تھے۔ انہیں دھاندلی سے سزائیں دی گئی تھیں یا دیگر متنازعہ فیہ امور کے فیصلے یونہی دھینگا مشتی سے کر دیئے گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی۔ عدالتوں میں قاعدے اور قانون کے مطابق مقدمات پیش ہوتے رہے۔ اصول اور ضابطہ کے مطابق ان کی سماعت ہوتی رہی اور قاعدے اور قانون ہی کے مطابق ان کے فیصلے ہوئے۔ جس کے حق میں ڈگری ہوئی اس نے اس مال کا ازروئے قانون قبضہ لیا جس کے خلاف فیصلہ ہوا، اس نے قانون ہی کی رُو سے اپنے ہاتھ سے اس مال کو دیا۔ جس ملزم کو سزا ہوئی، وہ بھی قاعدے اور ضابطے کے مطابق ہوئی۔ اس نے عدالت ماتحت کے فیصلے کے خلاف اپیل بھی قاعدے اور ضابطہ کے مطابق کی۔ حتیٰ کہ بعض مقدمات کی اپیلیں فیڈرل کورٹ تک بھی گئیں۔ اور وہاں سے ان کے فیصلے بھی ہوئے۔ یہ سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوا۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ ہر مقدمہ میں فی الحقیقت انصاف ہوا۔ لیکن قانون کی رُو سے جس چیز کو انصاف کہتے ہیں، وہ یقیناً ہوا۔ قانون کی رُو سے انصاف اس کو کہتے ہیں کہ ایک باضابطہ عدالت (یعنی ایسی عدالت جو ملک کے قانون کے مطابق قائم ہوئی ہو) متنازعہ فیہ معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر ان شہادات کی روشنی میں جو اس کے سامنے لائی جائیں، ملک کے مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ دیدے۔ اس تمام دوران میں یہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا۔

لیکن جونہی فیڈرل کورٹ نے اس قانونی سقم کا سراغ دیا، ملک میں ایک خلفشار پیدا ہو گیا۔ ہر شخص بغل میں عرضیاں دبائے عدالتوں کے دروازوں پر پہنچ گیا تاکہ اپنی عدالتوں کے کئے ہوئے سابقہ فیصلے (جن کی اپیلیں بھی مسترد ہو چکی تھیں) الٹوائے جائیں۔ چور، بدمعاش، ڈاکو، رہزن، فریب کار مجرم اُٹھے۔ کسی وکیل کو کچھ روپے دیئے اور وہ انہیں جیل خانے سے باہر لے آیا۔ مجرموں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔ وکیلوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ جس نے انکم ٹیکس ادا کیا تھا وہ یہ سوچنے لگا کہ میں اس ٹیکس کی بازیابی کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ جس نے سیل ٹیکس دیا تھا وہ قانونی مشورے لینے لگا کہ میں اس کی واپسی کا کس طرح دعوےٰ کر سکتا ہوں۔ جس نے رسومات (کسٹم) کی چنگی بھری تھی، وہ قانونی مشیروں کے پاس بھاگا پھرنے لگا کہ حکومت کے خلاف اصل اور ہرجانہ کا دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ ہر چھوٹے اور بڑے نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ میں اس قانونی سقم سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ غنڈوں اور بدمعاشوں سے لے کر بڑے بڑے مقدسین اور صالحین تک سب اسی رو میں بہہ گئے۔ سارے ملک سے ایک آواز بھی ایسی نہ اٹھی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ اگرچہ مجھے اس قانونی سقم سے یہ ذاتی فائدہ ہوتا ہے لیکن چونکہ میرے معاملہ کا فیصلہ ملک کی عدالت کی طرف سے ہو چکا ہے اس لئے میں اس سقم سے فائدہ اٹھانا قرینِ دیانت نہیں سمجھتا۔

یک نعرۂ مستانہ زجائے نشنیدم
ویراں شود آں شہر کہ میخانہ ندارد

کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتے تھے (یا فی الواقعہ بے گناہ تھے)، انہیں تو یہ حق حاصل تھا کہ اس سقم کو فائدہ اٹھا کر جیلوں سے باہر آجاتے۔ لیکن اگر آپ جذباتی سطح سے ذرا نیچے جا کر معاملہ پر غور کریں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ کسی سقم سے فائدہ اٹھا کر بے گناہ کا جیل خانے سے باہر آجانا بلندیٔ سیرت کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر عدالت کسی بے گناہ کو سزا دیدے اور وہ رات کو دیکھے کہ جیل خانہ کا دروازہ کھلا رہ گیا ہے، اور پہرہ دار سو رہا ہے، تو کیا اس کے لئے جائز ہو گا کہ وہ چپکے سے جیل سے نکل بھاگے! اور اس کے لئے وجہ جواز یہ پیش کرے کہ چونکہ میں بے گناہ تھا اس لئے میں جیل میں کیوں بند رہتا۔ اگر کسی شخص کو کسی مستبد بادشاہ نے، بغیر مقدمہ چلائے یونہی جیل میں ٹھونس دیا ہو، اس کی صورت الگ ہو گی۔ لیکن جس ملزم کو عدالت نے مقدمہ کے بعد سزا دی ہو (خواہ وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہو) اس کے لئے کسی سقم سے فائدہ اٹھا کر جیل سے نکل آنا، قانون اور عدالت کی میزان میں کبھی حق بجانب قرار نہیں پا سکتا۔ اس کے لئے صواب کی راہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس حق کے لئے آخر تک لڑے کہ اُس کے جُرم کی دوبارہ تحقیق ہونی چاہیئے اور جب دوبارہ تحقیق

کے بعد وہ بے گناہ ثابت ہو، تو اسے پھر جیل سے باہر آنا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قانونی اسقام یا انتظامی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انسان کا نفس ہمیشہ اسے ابھارتا رہتا ہے۔ لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں سیرت و کردار کا حقیقی امتحان ہوتا ہے۔ مثلاً چیزوں کی قیمت سے کنٹرول اُٹھ جانے کے بعد جب دوکاندار دو گنی چوگنی قیمتیں وصول کرنے لگ جاتے ہیں تو ہم انہیں کیوں بُرا کہتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ سابقہ قانون کے منسوخ ہو جانے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت ان کا زائد قیمت طلب کرنا ملک کے کسی قانون کے خلاف نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ان کے اس عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ملک کے ان مصرحہ قوانین کے اوپر ایک اور "قانون" بھی ہوتا ہے جو کہیں لکھا نہیں ہوتا لیکن جس کی پابندی تقاضائے دیانت ہوتی ہے۔ اُس وقت یہ دوکاندار چونکہ اُس غیر مصرحہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس لئے معاشرہ میں نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی مصرحہ قانون کی عدم موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھانا قابلِ مذمت ہے اسی طرح کسی قانون میں سقم رہ جانے سے فائدہ اٹھانا بھی درخورِ تنفر ہے۔ سیرت کی بلندی، اسقام، اور مراعات سے فائدہ اٹھانا نہیں سکھاتی۔ وہ اپنا حق ثابت کر کے اپنے واجبات کے حصول کی تلقین کرتی ہے۔ یہ ہے وہ اہم نکتہ جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے حضرت یوسفؑ کے تذکارِ جلیلہ کو اپنی ابدیت کے دامن میں جگہ دی ہے۔ حضرت یوسفؑ بالکل بے گناہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں جیل خانے بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد، فرعون نے ان کی ذہانت و فطانت کو محسوس کر کے اپنا خاص قاصد جیل خانہ میں بھیجا کہ حضرت یوسف کو رہا کر کے دربار میں لے آئے۔ غور کیجئے یہ کوئی قانونی سقم نہیں تھا جس سے فائدہ اٹھانے کا سوال پیدا ہو۔ بادشاہ کا فیصلہ تھا اور اس قسم کے بادشاہ کا فیصلہ جو "انا ربکم الاعلیٰ" (اور "انا احی و امیت") کا دعویدار تھا۔ جس کا فیصلہ ملک کی آخری اتھارٹی کا فیصلہ تھا۔ بے گناہ یوسفؑ کے لئے کوئی "امر" مانع نہ تھا کہ وہ قاصد کے ساتھ فوراً جیل سے باہر آجاتے۔ لیکن یہی تو وہ مقام تھا جہاں سیرتِ یوسفی نے چمک کر سامنے آنا تھا۔ قاصد نے انہیں آکر رہائی اور تقرب خسروانہ کا مژدۂ جاں فزا سنایا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ حضرت یوسفؑ نے کیا کیا؟ کیا وہ جھٹ سے اُٹھ کر قاصد کے ساتھ ہو لئے؟ نہیں۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ قال ارجع الیٰ ربک فسئلہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ میں اس طرح جیل سے باہر نہیں آنا چاہتا۔ تم جاؤ اور بادشاہ سے کہو کہ وہ اس معاملہ کی دوبارہ تحقیق کرائے جس میں مجھے مجرم قرار دے کر سزا دی گئی تھی۔ "میں اس وقت جیل سے باہر آؤں گا جب میں اس مقدمہ میں بے گناہ ثابت ہوں گا۔ چنانچہ اس مقدمہ کا (RE-TRIAL) ہوا اور جب حضرت یوسفؑ کی بریت ثابت ہو گئی تو وہ پھر جیل سے باہر نکلے۔ یہ ہے حسنِ سیرت کا وہ مقام بلند جس کا مظاہرہ اربابِ عزیمت سے ہوتا ہے۔ یوسف صدیقؑ سے زیادہ بے گناہ اور فرعون کی حکومت سے زیادہ مستبد حکومت دنیا میں اور کونسی ہو سکتی تھی؟ لیکن عدالت کے (غلط یا صحیح) فیصلہ کے بعد حضرت یوسفؑ نے کسی سقم کا سہارا لے کر جیل سے نکلنا چاہا اور نہ ہی بادشاہ کے نظرِ عنایت کے تصدق۔ انہوں نے چاہا تو یہ کہ وہی عدالت جس نے انہیں مجرم قرار دیا تھا، ان کے مقدمے کی از سرِ نو تحقیق کرے اور اس کے بعد جب ان کی بریت قانوناً ثابت ہو جائے تو پھر وہ بطورِ استحقاق جیل سے باہر آئیں۔ یہ ہے وہ سیرت جس کا مطالبہ قرآن ہر اس شخص سے کرتا ہے جو دنیا میں صداقت اور عدالت سے متمسک ہونے کا دعویدار ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں (اس قانونی سقم کے سلسلے میں) جس سیرت و کردار کا مظاہرہ ہوا ہے وہ کس صورتِ حال کا آئینہ دار ہے؟ اس سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں سیرت و کردار کا کس قدر فقدان ہے اور لوگ کس طرح ذرا ذرا سے اسقام سے فائدہ اٹھانے کے لئے مضطرب و بے قرار رہتے ہیں۔ یہ حقیقت، مملکت کے لئے ایک بہت بڑے خطرے کی غمازی کرتی ہے۔ اگر کل کو (خدانخواستہ) ملک کسی ایسے حادثہ سے دوچار ہو جائے (مثلاً کسی سے جنگ چھڑ جائے) جس میں (جیسا کہ عام طور پر جنگ کے زمانہ میں ہوتا ہے) انتظامی مشینری کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ جائے، تو معلوم یہاں کے لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کیا کچھ نہ کر جائیں۔ ان "برادرانِ یوسفؑ" سے کچھ عجب نہیں کہ چند دراہم کاسدہ کے لالچ میں، یوسف جیسی متاعِ گراں بہا کو غیروں کے ہاتھ فروخت کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ گزشتہ دنوں کے واقعات فی الحقیقت ہمارے قومی کردار کا ایسا نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے ہر قلبِ حساس، اندیشہ ہائے دور و دراز سے لرزاں، اور ہر دیدۂ اعتبار، مستقبل کے تصور سے خوں نابہ فشاں ہو جاتی ہے، اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی نظام کی آخری منزل وہی ہوتی ہے جس میں پوری کی پوری انسانیت ایک سطحِ بلند پر پہنچ کر اپنے معاملات کو صحیح بصیرت کی روشنی میں حل کرتی جائے گی۔ لیکن جب تک انسان اپنے بچپن میں ہے اس کی تاریخ میں فرد کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو ایک خاندان میں بزرگ خاندان کو ہوتی ہے۔ جب کسی قوم پر نحوس دن آتے ہیں، اگر اس وقت اس میں ایک فرد بھی ایسا ہو جو اپنی نگہ بلند، کشادگیٔ سینہ، حرارتِ قلب، زورِ بازو اور عزمِ راسخ سے نکبت و نحوست کے امڈتے ہوئے سیلاب کو تھام لے، تو اس قوم کی کشتی اس طوفانِ بلا سے صحیح و سلامت ساحلِ مراد تک جا پہنچتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ایک قوم کی زندگی میں فرد کیا کام کر جاتا ہے، ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود ہماری تاریخ کے گذشتہ چند سال اس کی زندہ و تابندہ شہادات بہم پہنچانے کے لئے کافی ہیں۔ جب ہماری قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک راہ گم کردہ کارواں کی طرح، آوارۂ غربت تھی، ادھر ایک سے پوچھتی تھی کہ جاؤں کدھر کو میں۔ عین اس وقت اس قوم سے ایک مردِ مومن اٹھا اور اس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے ایک ایسی منزل کا نشان دیا جو روشنی کے بلند مینار کی طرح جگمگا رہی تھی۔ وہ حکیم الامت اس منزل کا سراغ دے کر چلا گیا، تو ملت کو ایک ایسا رہبرِ فرزانہ مل گیا جس نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلِ رشک دیانت کو اس مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دیا اور اپنی صحیح رہنمائی سے جریدۂ عالم پر اس حقیقت کو ثبت کر دیا کہ وہ فی الواقعہ اس آوارۂ منزل قوم کا قائدِ اعظم ہے۔ قائدِ اعظم کی تشریف برآری کے بعد، بدقسمتی سے اس قوم کی تقدیر سازی کا کام انسانوں کے اس انبوہ کے سپرد ہوا جسے قانون کی اصطلاح میں "مجلسِ دستور ساز" کے نام سے پکارا گیا۔ اس گروہ نے کامل سات سال تک قوم کو جس بُری طرح سے رُلایا ہے، دنیائے بدبختی و جانِ سیاہ پوشی میں شاید ہی اس کی مثال کہیں اور مل سکے۔ لیکن عین اس وقت جب ہجومِ ناامیدی سے قوم کے حساس طبقہ کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ ان کے ہاتھ سے دامانِ خیال یار تک چھوٹا جا رہا تھا "سبدار فیض کی کرم گستری" سے اس فنا آمادہ قوم میں پھر ایک فرد برسرِ اقتدار آگیا۔ اس نے اپنے آہنی عزم سے پہلے ناظم الدین وزارت کے کابوس کو سینۂ ملت سے اتارا۔ اور اس کے بعد اس نام نہاد مجلسِ آئین ساز کی آکاس بیل کو جڑ سے اکھیڑا تاکہ شجرِ ملت کے سرسبز و شاداب ہونے کی صورت پیدا ہو جائے۔

ناخدائے کشتیٔ ملت، محترم غلام محمد کی اس بروقت دستگیری پر قوم جس قدر بھی شکر گزار ہوتی کم تھی لیکن مفاد پرستوں کا وہ گروہ جس کے سامنے اپنے اغراض و مقاصد کے سوا کچھ نہ تھا، اس پر بھڑک اٹھا اور اس نے ملک میں اس قسم کی پیچیدگیاں پیدا کرنی شروع کر دیں جن سے بہبودِ ملت کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہ چل سکے۔ رفتہ رفتہ ان پیچیدگیوں نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ جن قلوب میں پاکستان کی بقا اور بہبود کا ذرا سا بھی خیال تھا، ان پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ ادھر ان قلوب کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف، وہ تمام گروہ جن کے سینے میں پاکستان کا بغض و عناد آتشِ خاموش کی طرح سلگ رہا تھا، بھوتوں کا ناچ ناچ رہے تھے۔ بارے الحمد کہ آج (دس مئی، بعد دوپہر، جبکہ طلوع اسلام کی آخری کاپی پریس میں جا رہی تھی) یہ مسرت انگیز و بہجت آمیز خبر سنی کہ عدالت عالیہ نے گورنر جنرل کے اقدام کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی ہمارا سرِ نیاز اس خدائے عزیز و حکیم کی بارگاہِ صمدیت میں سجدے کے لئے جھک گیا جس نے اپنی کرم گستری سے مملکتِ پاکستان کو ایک ایسے خطرہ سے بچا لیا جس کی عواقب کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دن پاکستان کی تاریخ میں ہزار شادمانیوں کا دن اور یہ ساعت، ملتِ اسلامیہ کی زندگی میں کروروں خوش بختیوں کی ساعت ہے۔

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد قرار آمد
بہشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرفہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
اگر شاخ خلیل از خون ما نمناک میگردد
ببازارِ محبت نقدِ ما، کامل عیار آمد
بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اے پیکرِ عزم و بسالت کہ دنیا تجھے غلامِ محمدؐ کہتی ہے! ہم ملتِ شریفۂ پاکستانیہ کی طرف سے، ادب و احترام سے جھکی ہوئی آنکھوں، لرزتے ہوئے ہونٹوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہزار عقیدت و صد ہزار سپاس گزاری کے گلہائے تازہ۔ تیری خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ یقین مانئے کہ فرطِ جذبات سے اس وقت ہمارے دل کی یہ حالت ہے کہ

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہ وفورِ جذبات اس احساسِ عمیق کی وجہ سے ہے کہ اس وقت پاکستان کتنے بڑے مہیب خطرہ سے بچ گیا۔ اور آپ نے اپنی مسلسل علالت اور پیہم پریشانیوں کے باوجود یہ ثابت کر دیا کہ

ہے ننگِ سینۂ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

اللہ کی ہزار نصرتیں آپ کے ساتھ ہوں! دربارگاہِ ایزدی سے آپ کو یہ توفیق ارزانی ہو کہ آپ اس نوزائیدہ مملکت کے سفینۂ برگِ گل کو ساحلِ مراد تک پہنچا کر دم لیں۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است

اب جبکہ قدرت کی طرف سے آپ کو موقعہ مل گیا ہے کہ آپ پاکستان کی تقدیر کو ایک خاص قالب میں ڈھال سکیں، ہمارا پُر خلوص مشورہ ہے، کہ آپ گذشتہ تجارب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ مجلس آئین ساز میں صرف ایسے افراد آنے پائیں جن کے سینے میں اسلام اور ملت کا درد، جن کی نگاہوں میں قرآن کی بصیرت، جن کی نگر بساطِ عالم سے آشنا اور جن کی خرد عقدہ کشائی ملت کی اہل ہو۔

قرآن نے استخلاف و استبدال قومی کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ایک برباد شدہ قوم کی جانشین قوم اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے کہ وہ اپنی پیش رفتہ قوم کی طرح نہ ہو وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم اس لئے اس نئی مجلس دستور ساز کے متعلق اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی پیش رفتہ اسمبلی کی طرح نہ ہو۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ تخریب پسند گروہ جس نے کہیں سیاست اور کہیں مذہب کے نقاب میں اس وقت تک پاکستان کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ آشیانۂ ملت کو اس کی دستبرد سے بچانے کی فکر کیجئے۔ یہ اپنے آپ کو مصلحین کہتے ہیں لیکن قرآن کا ارشاد ہے کہ الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون۔ یخٰدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم۔ ملک میں تمام خطرات کی جڑ یہی گروہ ہے جو عوام کی سادہ لوحی کی وجہ سے قائدین کا گروہ بنے پھرتا ہے، حالانکہ انہیں علم تک بھی نہیں کہ جہانبانی و جہاں رانی کہتے کسے ہیں۔

خدا جانے یہ کس نے کہدیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اٹھا لیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے

اور آخر میں ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ اس گروہ زاغ و زغن کے شور و شین سے بالکل نہ گھبرائیں اور نہایت عزم راسخ سے خدا کی راہ نمائی کی روشنی میں، اپنے فیصلوں کو بروئے کار لائے جائیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے سردست ہم انہی گزارشات پر اکتفا کرتے ہیں۔ باقی رفتہ رفتہ پھر عرضِ خدمت کرتے رہیں گے

لختِ دل پر خونے از دیدہ فرو ریزم
لعلے زمیراث خم بر دارد بجانم زن

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں

اب جبکہ آپ جیل سے باہر تشریف لے آئے ہیں، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کی توجہ ایک اہم بات کی طرف مبذول کرائی جائے۔ آپ کی جماعت نے مدت سے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ موقعہ بے موقعہ، ہر جگہ، ہر طریق سے طلوع اسلام کو بدنام کیا جائے ہمیں اس حقیقت کے اعتراف و اعلان میں کوئی باک نہیں کہ طلوع اسلام آپ کے تصورات اور آپ کی جماعت کے مسلک و عزائم کو اسلام اور پاکستان دونوں کے لئے سخت خطرے کا موجب سمجھتا ہے اس لئے وہ ان تصورات و مقاصد کی مخالفت اپنا ملی اور دینی فریضہ قرار دیتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ کی جماعت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں جو مناسب سمجھیں کہیں اور کریں۔ لیکن مخالفت کا یہ انداز تو کسی شریف معاشرہ میں بھی درخورِ تحسین نہیں سمجھا جائے گا کہ اپنے مخالف کے خلاف غلط الزامات لگائے جائیں۔ بہتان تراشے جائیں اور بے بنیاد اتہامات سے اسے بدنام کیا جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی جماعت نے طلوع اسلام کی مخالفت میں بڑی شدت سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے اور یہ خیال عام کر رکھا ہے کہ ایسا کرنا دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ان اتہامات کی فہرست میں اب کچھ عرصہ سے ایک نئی تہمت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے "سُنّتِ رسول اللہ" کی توہین"۔ یہ بہتان تراشا گیا ہے اس طلوع اسلام کے خلاف جس کی زندگی کا ایک ایک سانس اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی عظمت و برگزیدگی کی بلندی کے لئے وقف ہے جو شرف و مجدِ انسانیت کے افقِ اعلیٰ پر فائز المرام ہے۔ بہر حال، طلوع اسلام نے، حقیقت کو واشگاف کرنے کے لئے

(۱) ایک مقالہ لکھا جس میں سُنّت رسول اللہؐ کے متعلق اپنے مسلک کی وضاحت کی۔ اور

(۲) آپ کی تحریروں پر مشتمل ایک مضمون مرتب کیا جس میں بتایا کہ حدیث اور سُنّت کے متعلق آپ بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو طلوع اسلام کہتا ہے۔

اور انہیں طلوع اسلام کی ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع کر کے، جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے بالخصوص درخواست کی کہ وہ ہمیں بتائیں کہ ہماری غلطی کہاں ہے تاکہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں۔ اس کے متعلق ہم نے محترم امین احسن صاحب اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں نجی خطوط بھی لکھے اور پھر طلوع اسلام میں کئی مرتبہ یاد دہانی بھی کرائی۔ لیکن ان حضرات (یا جماعت اسلامی میں سے کسی دوسرے صاحب) کی طرف سے اس کے متعلق ہمیں کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ مگر ہمارے خلاف سب و شتم کا سلسلہ ہے کہ بدستور جاری ہے بلکہ تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔

ہم آپ کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ آپ براہ کرم ہمارے اس مقالہ اور مضمون کا مطالعہ فرمائیں، اور ہمیں مطلع فرمائیں کہ

(۱) اس مضمون میں ہم نے آپ کی جو تحریریں نقل کی ہیں ان میں کسی قسم کی تحریف تو نہیں کی گئی اور ایسا تو نہیں ہوا کہ انہیں اس طرح مربوط صورت میں شائع کرنے سے ان کا مطلب بدل گیا ہو

(۲) سنت رسول اللہ کے متعلق ہم نے اپنا جو مسلک بیان کیا ہے، وہ آپ کے نزدیک درست ہے یا نہیں۔ اگر درست نہیں تو اس میں کیا غلطی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی گزارش کریں گے کہ آپ اپنے کسی ایسے مضمون کی نشان دہی کر دیں جس میں ایک ہی جگہ حدیث اور سُنّت کے متعلق آپ کا مسلک واضح اور مکمل طور پر بیان ہوا ہو۔ اگر کوئی ایسا مضمون نہ ہو، تو ہم درخواست کریں گے کہ آپ اس قسم کا کوئی جامع مضمون اب تحریر فرما دیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس باب میں آپ کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس موضوع پر آپ کی تحریروں میں اس قدر متضاد باتیں ملتی ہیں کہ آپ کی جماعت ہر موقعہ پر ایک نئی بات آپ کی طرف سے پیش کر دیتی ہے۔

چونکہ اسلامی نظام (دین) میں سنت ایک اہم مقام رکھتی ہے اس لئے ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری مندرجہ بالا درخواست کو شرفِ پذیرائی عطا فرمائیں گے۔

مسئلہ کشمیر

وزیر اعظم محمد علی اور وزیر اعظم نہرو کی ملاقات کے چرچے مہینوں سے ہو رہے تھے، اور بار بار کے التوا کے بعد اس کی تاریخ انعقاد بالآخر ۱۴ مئی کو طے پائی۔ لیکن جوں جوں یہ تاریخ قریب آتی جاتی ہے، طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ ایک طرف یہ افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں کہ یہ ملاقات پھر ملتوی ہو جائے گی اور دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ دونوں وزرائے اعظم کشمیر میں موجودہ خط متارکہ کی بنا پر سمجھوتہ کر لیں گے اور اس کے صلے میں پنڈت نہرو دیگر تنازعات میں پاکستان کو بھاری

رعایتیں دب گئے۔ ان افواہوں کی نوعیت سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ انہیں نئی دہلی سے پھیلایا جا رہا ہے اور اس کا مقصد تقسیم کشمیر کے حق میں رائے تیار کرنا ہے۔ نیز پاکستان کو ایک طرف یہ جھکمہ دینا ہے کہ اس کی کسر دوسرے معاملات میں نکال دی جائے گی۔ اور دوسری طرف یہ دھمکی کہ اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوا تو بڑی آسانی سے مذاکرات ملتوی کئے جا سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ التوا کا نتیجہ یہی ہوگا کہ کشمیر بدستور ہندوستان کے قبضے میں رہے گا۔

ان افواہوں کو لندن سے اور زیادہ اچھالا گیا ہے۔ انہی دنوں لندن ٹائمز نے اپنے نامہ نگار متعینہ نئی دہلی کی وساطت سے خصوصیت سے اس خبر کو چاردانگ عالم میں پھیلایا۔ برطانیہ کی پالیسی شروع سے ہی نمایاں طور پر ہندوستان کے حق میں رہی ہے اور اس نے علانیہ پاکستانی مفاد کو صدمہ پہنچایا ہے۔ لہٰذا یہ بھانپنا مشکل نہیں کہ وہ کیوں ہندوستانی مطالبات کا بالواسطہ مؤید ہے۔ لیکن انگریز کے مصالح اس ضمن میں کچھ بھی ہوں، پاکستان کا موقف بالکل واضح ہے۔ کشمیر کو ہندوستان کے چنگل سے نکلوانا ہمارا ملی فریضہ ہے۔ وہاں کے چالیس لاکھ مظلوم مسلمان آزادی کا اتنا ہی حق رکھتے ہیں، جتنا ہندوستان کے کروڑوں ہندو۔ ہندوستان کا کشمیر پر قبضہ دھاندلی سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ اس پر مصر اس لئے ہے کہ وہ جانتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور وہ کشمیر پر قابض رہ کر پاکستان کی شہ رگ پر قابض رہے گا اور اہل پاکستان کا جینا اور مرنا اس کے رحم و کرم پر ہوگا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری قیادت نے اس نقطہ کو کما حقہٗ نہیں سمجھا اور وہ سات سال تک ہندوستان کی بے جا خوشامد میں مصروف رہی۔ اسے ہندوستان نے بجا طور پر ہماری کمزوری پر محمول کیا اور خوب فائدہ اٹھایا۔ اب بھی ہندوستان کے رویہ میں بظاہر کسی تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اگر اس مسئلہ میں باہمی مفاہمت نہ ہو تو اس کا فائدہ ہندوستان کو پہنچتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ارباب حکومت اب بھی آنکھیں کھولیں گے یا نہیں؟ کشمیر جیسا مسئلہ جس پر پاکستان کی بقا کا دار و مدار ہے برسوں تک معلق نہیں رکھا جا سکتا۔ اب وقت ہے کہ ہندوستان کو واضح طور پر جتا دیا جائے کہ اگر وہ بین الاقوامی معاہدہ کی رو سے استصواب کے لئے تیار نہیں تو ہم براہ راست مذاکرات کا ڈھونگ ختم کر دیں گے اور کشمیر کو آزاد کرانے کے متبادل و مناسب ذرائع پر عمل کریں گے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے سامنے پُرامن راہ تو یہ ہے کہ معاملہ پھر سے اقوام متحدہ کے سامنے لے جائیں اور اسے مجبور کریں کہ وہ ہندوستان سے استصواب کی تجویز پر عمل کرائے۔ اگر وہ لیت و لعل سے کام لے تو پرامن ذرائع ختم ہو جائیں گے اور صرف ایک ہی صورت باقی رہ جائے گی اور وہ ہوگی جنگ کی۔ ہم جنگ کے حق میں نہیں اور ہمیں خوشی ہوگی کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچے۔ لیکن قوموں کی زندگی میں ایسے لمحات آ جاتے ہیں جب حق کی حفاظت کے لئے جان تک بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ اس وقت زندگی اندیشۂ سود و زیاں سے برتر ہو جاتی ہے اور "جان" کے بجائے "تسلیم جان" ہی اصل حیات بن جاتی ہے۔

قومی گیت

ہم نے ۱۲ مارچ کی اشاعت میں حکومت پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ بعد کی بدمزگیوں اور خرابیوں سے بچنے کے لئے مناسب یہی ہے کہ جو قومی گیت موصول ہوئے ہیں، انہیں شائع کر دیا جائے تاکہ قوم انہیں بروقت جانچ سکے اور حکومت کو فیصلے میں مشورہ اور مدد دے سکے۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت نے اس مخلصانہ مشورے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ چنانچہ موصول شدہ قومی گیت شائع کرنا تو در کنار آج تک یہ بھی روا نہیں رکھا گیا، کہ بتا دیا جائے کہ کتنے گیت موصول ہوئے، اور وہ کس کس زبان میں ہیں، ان کے لکھنے والے کون ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں جو خبریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں، وہ پریشان کن ہوتی ہیں۔ مثلاً معاصر "ٹائمز آف کراچی" کی روایت ہے کہ حکومت کو مختلف زبانوں میں کوئی ڈھائی سو گیت موصول ہوئے (پہلے خبر ایک سو کی تھی) ان میں سے وزارت اطلاعات نے صرف نو کو منتخب کر کے کابینہ کے پاس بھیجا ہے۔ ایک "سابق سفیر" کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے بھی ایک گیت مقابلے میں بھیجا ہے۔ حالانکہ انہیں اعتراف ہے کہ ساری عمر انہیں موسیقی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ایسی خبریں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا موجب ہو جاتی ہیں اور ہم حیران ہیں کہ حکومت کیوں صحیح اطلاع دینے سے احتراز کر رہی ہے۔ یہ مسئلہ قوم سے متعلق ہے اور اسے قومی سطح پر قومی استصواب سے فیصل کرنا چاہیئے۔ یہ معاملات رازداری کے نہیں ہوتے۔ رازداری کا نتیجہ دیگر شعبوں کے علاوہ قومی ترانے کے سلسلہ میں جس حد تک گھناؤنا ثابت ہو چکا ہے اسے فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

اسی ضمن میں ایک جگر خراش حقیقت اور بھی ہے جسے اگر سامنے رکھ لیا جائے تو شاید ہم بہت سی تباہیوں سے بچ جائیں۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ تاریخ امم یہ ہوتی ہے کہ "شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر" ہم خوش تھے کہ ہم میں شمشیر و سناں نہیں رہی تو نہ سہی، طاؤس و رباب تو ہے! لیکن پردہ اٹھ جانے کے بعد جو منظر دکھائی دیا اس میں نظر آیا کہ ہم میں "طاؤس و رباب" بھی باقی نہیں رہا۔ اس "طاؤس و رباب" کی سب سے بڑی مظہر ہماری شاعری ہو سکتی تھی۔ جہاں تک شاعروں کی تعداد کا تعلق ہے وہ ٹڈی دل سے کم نہیں۔ لیکن پاکستان کی سات سالہ زندگی میں جب ایک موقع پر شاعری سے کام لینے کا وقت آیا تو اس کی "قامت کی درازی کا سارا بھرم کھل گیا"۔ ساری قوم کے شاعر ہفتوں نہیں، برسوں ٹکریں مارتے رہے اور ان سے ایک قومی ترانہ نہ بن پایا۔ جو ترانہ حکومت نے منتخب کیا، اس کی بابت خود حکومت نے بعد میں کہہ دیا کہ وہ قومی ترانہ تو بن سکا ہے لیکن قومی گیت نہیں بن سکا۔ "قومی ترانہ" اور "قومی گیت" کا یہ فرق تاریخ کے سامنے شاید پہلی مرتبہ آیا ہو؟ اب "قومی گیت" کے لئے اڑھائی سو شعرائے کرام نے طبع آزمائی کی ہے اور ان میں سے صرف نو اس قابل سمجھے گئے ہیں کہ انہیں کابینہ کے حضور پیش کیا جا سکے۔ ان نو میں سے جو گیت آخرکار منظور ہوگا اس کی بابت شاید دو چار ماہ کے بعد کہہ دیا جائے گا کہ وہ قومی گیت تو بن سکا ہے، قومی نغمہ نہیں بن سکا۔

یہ ہے ہمارے "طاؤس و رباب کی حیثیت"! قرآن نے جو کہا ہے کہ جہنم میں زندگی تو ایک طرف، موت بھی نہیں آیا کرتی، تو اس کا یہی مطلب ہے کہ غلاموں کو جینا تو ایک طرف مرنا بھی نہیں آیا کرتا۔

حکومت وضاحت کرے

جہاں تک اخباری اطلاعات کا تعلق ہے حکومت پاکستان نے یہ اعلان کیا تھا کہ پنجاب کے مارشل لا کے اسیروں کے کاغذات فیڈرل کورٹ کے ایک جج کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور ان کے فیصلے کے مطابق ان کی سزاؤں میں رد و بدل کر دیا جائے گا۔ پھر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس طریق کے مطابق مولانا مودودی صاحب کی میعاد قید کم کر دی گئی ہے۔ اب جو مولانا صاحب ضمانت پر رہا ہو کر باہر آئے ہیں تو اسلامی جماعت کا ترجمان، روزنامہ تسنیم لاہور، ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہم آج تک تمام اسیران مارشل لا کی نظربندی کو ایک ظلم سمجھتے رہے ہیں اور ہمارا مطالبہ رہا ہے کہ ان لوگوں کو فوراً رہا کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس ملک کے حکمرانوں نے آج تک نہ اس معقول مطالبے کو تسلیم کیا اور نہ عوام کی طرف سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا۔ بلکہ خود ہی ان لوگوں کی طرف سے کچھ کاغذات تیار کر کے فیڈرل کورٹ کے ایک جج کے نام سے ان میں سے بعض کی سزاؤں میں رد و بدل کر دیا۔ اور اس طرح ان لوگوں کو جیل میں رہنے پر مجبور کیا۔"

"تسنیم" کے اس بیان کے مطابق، پوزیشن یوں ہوئی کہ حکومت نے کورٹ کے کسی جج سے مشورہ یا فیصلہ لینے کی بجائے خود ہی متعلقہ اسیروں کے کاغذات تیار کئے اور فیڈرل کورٹ کے ایک جج کے نام سے بعض کی سزاؤں میں رد و بدل کر دیا۔ اگر حکومت نے واقعی ایسا کیا تھا تو یہ نہ صرف اس کی اعلان کردہ پالیسی ہی کے خلاف تھا بلکہ اصولاً بھی سخت قابل اعتراض تھا اس لئے کہ حکومت کا خود ہی کوئی فیصلہ کر لینا اور اسے فیڈرل کورٹ کے کسی جج کے نام سے مشہور کر دینا، کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا!

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔

اسلامی معاشرت
صفحات ۱۹۲
قیمت دو روپے

تاریخی شواہد

(۱۴)

جیسا کہ سابقہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے۔ تورات کی رُو سے اقوامِ عالم کی تقسیم حضرت نوح کے تین بیٹوں (یافث ۔ حام اور سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تورات کی اس تقسیم کی تاریخی حیثیت کچھ ہی ہو لیکن تحقیقاتِ جدیدہ اس نتیجہ تک ضرور پہنچ چکی ہیں کہ عرب اور اس کے گرد و پیش (مصر۔ شام۔ عراق وغیرہ میں) امم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قبیلہ عاد کا تھا۔ قبیلہ کیا! یہ تو ایک عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف حضر موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام پر حکمران تھی۔ تقریب دو اڑھائی ہزار سال (ق ۔ م) ان تمام علاقوں پر اسی قوم کا تسلط و اقتدار نظر آتا ہے۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انھیں عادِ ارم بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو اڑھائی ہزار سال (ق ۔ م) اس قوم کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا تو اس زمانہ میں قوموں کے عروج و زوال کی رفتار کے اعتبار سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی ابتدا کب ہوئی ہوگی؟ یوں سمجھئے کہ قومِ نوح کی بربادی کے بعد جب یہ علاقے دوبارہ آباد ہوئے ہیں تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی ہے۔ یہی قومِ عاد ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے۔ ان کا مقامِ بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طویل عریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ تمثال ریت کے ٹیلے، خوف و دہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اسے اس طرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر محکمۂ آثارِ قدیمہ والے ہی ان کا سراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے۔ کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبادیاں، قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کم از کم ایک کا ذکر تو سُن لیجئے یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہود کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے نقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے۔ الّا ان کے جو حضرت ہود کے ساتھ بچا لئے گئے اور جو پھر عادِ ثانیہ کہلائے۔ کیونکہ عادِ اولیٰ وہ تھے جنہیں ان کی غلط روشِ زندگی کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیا گیا۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت نوح کی قوم کے بعد قومِ عاد کو ان کا جانشین بنایا گیا اور انہیں دنیا میں بڑا اقتدار و تسلط اور وسعت و قوت عطا فرمائی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۷/۶۹)

تم اس حقیقت کو سامنے لاؤ کہ اس نے کس طرح قومِ نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہیئے کہ اللہ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔

آبپاشی و سیرابی کے لئے قدم قدم پر چشمے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات۔ اولاد اور مویشی کی کثرت یہی کچھ اس زمانہ میں قوت و سطوت کے حصول و استحکام کے ذرائع تھے۔ غرضیکہ ہر شے کی فراوانی تھی۔ حضرت ہود نے انہیں قوانینِ الٰہیہ کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہی انعاماتِ خداوندی کی طرف اشارہ کیا تھا

وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُم بِمَا تَعْلَمُونَ ۝ أَمَدَّكُم بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ۝ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ (۲۶/۱۳۲–۱۳۴)

اور اس خدا کے قوانین کی نگہداشت رکھو جس نے تمھیں وہ چیزیں بکثرت دیں جو تمھیں معلوم ہیں۔ اُس نے تمہیں مواشی اور اولاد بکثرت دی۔ نہ صرف یہی بلکہ باغات اور چشمے بھی بکثرت دیئے!

وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بڑی بڑی عمارات بناتے تھے جو ایک طرف ان کی شوکت و رفعت کی مظاہر تھیں اور دوسری طرف دشمنوں کے خلاف پاسبانی کے مقاصد پورا کرتی تھیں۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ (۲۶/۱۲۸)

(اور دیکھو، اے قومِ عاد!) کیا تم ہر بلندی پر ایک نشان بناتے ہو؟ یہ چیزیں تمہیں غلط روشِ زندگی کے نتائج سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔

وہ ایسے ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے حکومت کرنی ہے۔

وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝ (۲۶/۱۲۹)

(اور اے قومِ عاد!) کیا تم مضبوط مضبوط قلعے بناتے ہو، شاید تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہو گے؟

اسی بنا پر قرآن کریم نے انہیں "ستونوں والے" کہا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (۸۹/۶–۸)

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے قومِ عاد کے ساتھ کیا کیا؟ (کون سی قومِ عاد!) وہی بڑے بڑے ستونوں والی قوم ارم! جس کے مثل شہروں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

غرضیکہ انہیں ایسا تمکن فی الارض عطا ہوا تھا کہ شاید ہی کسی دوسرے کے حصہ میں آیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ تمام قوت و حشمت، جہالت و بربریت کو لئے ہوئے نہ تھی۔ بلکہ انہیں ذرائع علم (سماعت، بصارت و قلب) بھی عطا ہوئے تھے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً (۴۶/۲۶)

(اور دیکھو) ہم نے انہیں وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو ہم نے زمین میں تمہیں بھی نہیں بخشی، اور انہیں (سننے کے لئے) کان، (دیکھنے کے لئے) آنکھیں، اور (سمجھنے کے لئے) دل (عقل و شعور) عطا کئے تھے۔

قرآن نے سمع و بصر کے الفاظ اس علم کے لئے استعمال کئے ہیں جو مظاہرِ فطرت پر غور و خوض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) جو حواس کے ذریعے، مشاہدات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سمع و بصر، حواس کے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ تیسرا لفظ افئدہ ہے۔ اس کے معنی (MIND) کے ہیں۔ یعنی مشاہداتِ فطرت سے معلومات حاصل کر لینے کے بعد، قلب اور دماغ کے ذریعے استنباطِ نتائج کرنا۔ اس قسم کا علم تھا جو قومِ عاد کو حاصل تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اس علم کا ماحصل (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ سائنس کی ایجادات وغیرہ) قانونِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ قوانینِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ علم کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے صرف کیا جائے لیکن جو قومیں غلط روشِ زندگی پر چلتی ہیں وہ ان قوتوں کو باقی انسانوں کی غلامی کا ذریعہ بنا لیتی ہیں اور ان کی محنت کی کمائی کے سلب و نہب (EXPLOITATION) کو اپنی کاریگری قرار دے لیتی ہیں۔ یہی کچھ قومِ عاد کرتی تھی چنانچہ قرآن میں ہے کہ ہر مستبد قوم کی طرح، ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جن قوموں پر جبر و قہر کا آہنی شکنجہ میں جکڑ لیا کہ ان کی غلامی کے حبال کا کوئی حلقہ ڈھیلا نہ ہونے پائے۔

وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝ (۲۶/۱۳۰)

اور جب تم لوگوں پر گرفت کرتے ہو تو بڑے با جبروت بن کر گرفت کرتے ہو کہ کوئی تمہارے چنگل سے نکلنے ہی نہ پائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق ان میں رسول بھیجے لیکن نشۂ قوت و حکومت میں پیغاماتِ خداوندی پر کان کون دھرتا ہے؟ انھوں نے متواتر ان رسولوں کی تکذیب کی اور اپنے ظلم و استبداد میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶/۱۲۳)

قومِ عاد نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں جزیرۂ عرب کی جغرافیائی پوزیشن اور عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات، سرحدات پر متمدن ملکتوں کا وجود، خود عربوں میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی تھی۔ آج کی فرصت میں عربوں کے متعلق علمائے عمرانیات اور دیگر محققین کی اس تحقیق کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے کہ عقلی اعتبار سے عربوں کا کیا مقام تھا۔ اور ان کی قومی خصوصیات اور امتیازات کیا تھے۔

"یہ لوگ جونہی کسی ملک پر تسلط جما لیتے ہیں تو وہ ملک بہت جلد تباہ و برباد ہو جاتا ہے کیونکہ یہ لوگ وحشی قوم کے افراد ہیں۔ عمارتوں کو توڑ کر پتھر اٹھا کر لے جائیں گے۔ تاکہ ان پتھروں سے چولہے بنا کر اپنی ہانڈیاں ان پر چڑھا سکیں۔ چھتوں کو گرا دیں گے۔ تاکہ اس کی لکڑیوں پر اپنے خیمے کھڑے کر سکیں۔ اور ان کو توڑ کر اپنے خیموں کے لئے میخیں اور کھونٹیاں بنا سکیں۔ ان کے ہاں لوٹ مار کی کوئی حد مقرر نہیں۔ جہاں پہنچ کر وہ رک جائیں۔ نہ قوانین و احکام سے کوئی سروکار ہے۔ نہ فسادات سے لوگوں کو باز رکھنے کی طرف کوئی توجہ ہے۔ ان کا سب سے بڑا مقصد لوٹ مار کے یا کسی تاوان میں لوگوں کے اموال پر قبضہ کر لینا ہوتا ہے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد لوگوں کے حالات کی درستگی اور ان کے مصالح پر غور کرنے سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ حکومت کے معاملہ میں یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں گے۔ بہت کم ایسا ہوگا کہ حکومت کے معاملہ میں کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کی اطاعت کر سکے۔ خواہ وہ اس کا باپ، بھائی یا قبیلہ کا سردار ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حکام لامحالہ متعدد ہوتے ہیں۔ رعایا کو احکام دینے اور ٹیکس وصول کرنے میں دن بدن ہاتھوں کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ تہذیب و تمدن تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر جن ممالک پر ان کا قبضہ ہوا ہے تم ان کے حالات دیکھ لو کہ کس طرح ان کی تہذیب ختم ہو گئی۔ اور کس طرح ان کے باشندے دانہ دانہ کو محتاج ہو گئے — یمن کو دیکھ لو — جو ان کا پایۂ تخت تھا کہ چند شہروں کو چھوڑ کر سارا ہی تباہ ہو چکا ہے۔ عراق عرب کو دیکھ لو کہ ایران کے ماتحت وہ کس طرح منظم تھا۔ اور ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر کس طرح برباد ہو گیا۔ اس زمانہ کے شام کو دیکھ جاؤ۔ اس کا حال بھی کچھ اس سے بہتر نہیں پاؤ گے۔[1]

اپنی فطری طبیعت کی شدت، مقابلہ، بلند ہمتی اور منافست کی بنا پر بھی یہ لوگ آپس میں بھی ایک دوسرے کے مطیع اور فرمانبردار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی خواہشات بہت کم کسی ایک نقطہ پر جمع ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی حکومت قائم کرنے کے لئے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ نبوت یا ولایت کا دینی رنگ دیا جاتا۔ یا بالجملہ دین ہی کا کوئی گہرا اثر پیدا کیا جا سکتا۔[2]

جو نو آبادیاں یہ لوگ قائم کرتے تھے۔ وہ بھی جلد ہی تباہ و برباد ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ نو آبادیاں قائم کرنے میں بھی یہ حسن انتخاب کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ وہ نہ جگہ کو دیکھتے تھے۔ نہ ہوا کی عمدگی کو نہ پانی کو۔ نہ کھیتوں اور چراگاہوں کو — انہی باتوں کے فرق سے شہر کی عمدگی اور خرابی کا فرق پڑا کرتا ہے۔ عرب لوگ ان باتوں سے قطعاً ناآشنا تھے۔ وہ لوگ تو محض اپنے اونٹوں کی چراگاہوں کا خیال رکھ سکتے تھے۔ پانی کی انہیں پروا نہیں تھی اچھا ہو یا خراب ہو۔ کم ہو۔ یا زیادہ ہو۔ وہ یہ پوچھتے ہی نہیں تھے کہ کھیتوں کے لئے یہاں کی زمین کیسی ہے۔ ہوا اچھی ہے۔ یا خراب ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ انہوں نے کوفہ، بصرہ اور قیروان میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں، انہوں نے محض ان باتوں کا خیال رکھا ہے کہ یہ جگہیں اونٹوں کے لئے کسی چراگاہ اور عرب کے ریگستانوں سے قریب تر ہو سکتی ہیں۔ اس کے برعکس ان تمام طبعی حالات سے جو شہروں کی آبادی کے لئے لازمی ہونے چاہئیں۔ انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان جگہوں کی اپنی کوئی پیداوار نہیں تھی۔ جو عربوں کے بعد ان کو آباد رکھنے میں مدد دے سکتی۔ ان کی جائے وقوع سکونت و قیام کے لئے غیر فطری تو تھی ہی ساتھ ہی یہ جگہیں مختلف قوموں کے درمیان میں بھی واقع نہیں تھیں کہ لوگ انہیں آباد رکھتے۔ چنانچہ اول وہلہ ہی میں — جوں ہی عربوں کی حکومت مضمحل اور ان کی عصبیت ختم ہوئی۔ جو ان کی زندگی کا باعث تھی — ان شہروں پر بربادی اور تباہی آنی شروع ہو گئی۔[3]

صنعت و حرفت سے یہ لوگ بہت دور تھے۔ کیونکہ قدیم الایام سے یہ لوگ بدوی زندگی گذارنے کے عادی اور تمدن و حضارت سے دور چلے آ رہے تھے۔ صنعت و حرفت ایسی چیزیں ہیں جو تمدن و حضارت کے ساتھ ہی چل سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے وطن یعنی جزیرۂ عرب اور ان ممالک میں جن کے وہ اسلام کے بعد مالک ہوئے تھے۔ صنعت و حرفت کو بہت کم فروغ حاصل ہو سکا۔ حتیٰ کہ عموماً زیادہ تر چیزیں غیر ممالک سے برآمد کی جاتی تھیں۔[4]

علم و فن سے بھی ان کو کوئی علاقہ نہیں تھا۔ کیونکہ علوم و فنون ایسے ملکات کا نام ہے۔ جو تعلیم کے محتاج ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی صنعت ہی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ اور عرب لوگ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ صنعت سے بہت دور تھے۔ اسی وجہ سے علوم و فنون ہمیشہ شہری رہے ہیں۔ اور عرب لوگ علوم و فنون کے بازاروں سے ہمیشہ دور رہے۔ شہری لوگ اس زمانہ میں عجمی ہی تھے۔ یا وہ آزاد شدہ غلام جو دراصل عجمی ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حاملین علم اسلام میں بھی زیادہ تر عجمی ہی رہے۔ یا وہ لوگ رہے۔ جن کی تربیت عجم میں ہوئی تھی اور جن کی زبان خالص عربی نہیں رہی تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم کی حفاظت اور تدوین کے لئے سب سے پہلے عجمی ہی اٹھے۔[5]

ان تمام باتوں کے باوجود ان لوگوں میں حق اور راستی کو جلد تر قبول کر لینے کی صلاحیت ضرور موجود تھی۔ جو متمدن اقوام میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کے طبائع میں سلامتی تھی اور تمدن کی کجروی سے یہ لوگ ناآشنا تھے۔ حضارت کے کمینہ اخلاق و عادات سے یہ لوگ پاک تھے۔ ان میں وہی عیوب موجود تھے جو توحش کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔ مگر یہ عیوب ایسے لوگوں کو جفاکشی اور قبول خیر سے قریب تر کر دینے والے ہوتے ہیں۔[6]

یہ لوگ شجاعت اور بہادری سے قریب تر تھے۔ کیونکہ یہ لوگ شروع سے اپنی مدافعت خود ہی کرنے کے عادی تھے۔ یہ فرض انہوں نے کبھی دوسروں کو نہیں سونپا تھا۔ انہوں نے اپنا بچاؤ دوسروں کے ذریعہ کرنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے ہتھیار بند رہتے تھے۔ وہ ایک آواز پر ہر طرف سے جمع ہو جانے کے عادی تھے۔ جنگ و جدل ان کی عادت اور شجاعت ان کی فطرت بن گئی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ متوحش بادیہ نشین عرب ہمیشہ اپنے امراء اور حکام سے زیادہ جنگ آزما تھے اور بہادر ثابت ہوئے ہیں۔[7]

دوسری تمام قوموں کے مقابلہ میں عرب لوگ ہمیشہ سے وضاحت کلام اور طلاقت لسان اور فصاحت نطق کے ساتھ موصوف رہے ہیں۔ دوسری تمام قوموں کے مقابلہ میں عربوں کو یہ امتیاز اور خصوصیت پہلے دن سے حاصل رہی ہے۔[8]

۴ — اولیری[9] کا بیان ہے کہ عربی آدمی جسے مثال اور نمونہ شمار کیا جا سکے — قطعاً مادی ہوتا ہے۔ وہ تمام چیزوں کی طرف مادی نگاہ سے ہی دیکھتا ہے۔ وہ چیزوں کی قدر و قیمت محض اس اندازے سے لگاتا ہے کہ ان سے اسے کیا نفع حاصل ہوگا۔ حرص اور طمع اس کے حواس پر چھائی ہوئی ہوتی ہے، خیال اور جذبات کی اس کے ہاں کوئی جولانگاہ نہیں ہوتی وہ زیادہ تر کسی دین کی طرف میلان نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی وہ کسی چیز کی پروا کرتا ہے۔ وہ چیزوں کی اتنی ہی پروا کر سکتا ہے جتنا اسے ان سے کوئی عملی فائدہ ہو سکے۔ عزت نفس کا اسے پورا پورا شعور ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ تسلط و تغلب پر برافروختہ ہو جاتا ہے، خواہ وہ کسی شکل میں بھی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ سردار قبیلہ اور امیر لشکر کو بھی پہلے دن سے جب سے اسے سرداری کے لئے منتخب کیا گیا ہو۔ ہر فرد قبیلہ سے حسد، بغض اور خیانت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ خواہ وہ اب سے پہلے اس کا کتنا ہی مخلص دوست کیوں نہ رہا ہو۔ جو آدمی اس پر احسان کرتا ہے۔ وہ اس سے انتقام لینے کے درپے رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا احسان اس کے اندر اپنی ذلت اور فروتنی کے احساس کو بیدار کر دیتا ہے۔ چنانچہ احسان کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ احسان کرتے ہوئے اتنا ضرور کہہ دے۔ "آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں" ایک عربی شخص انفرادی حریت کا نمونہ ہے۔ لیکن ایسی انفرادی حریت جس میں بڑی حد تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

---

۱ ابن خلدون ص۱۲۵ ۲ ایضاً ص۱۴۱ ۳ ابن خلدون ص۳۰۰ ۴ ایضاً ص۳۳۱ ۵ ایضاً ص۴۷۹ ۶ ایضاً ص۱۲۷ ۷ ایضاً ص۱۲۱ ۸ ایضاً ص۳۶۱ ۹ ملاحظہ ہو اولیری کی کتاب

عورت کا قرآن

(۱۲)

(۹) وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ
بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ
إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا
بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ (حجرات رکوع ۱)

اور اگر خود مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان حتی الامکان فوراً صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہو یہانتک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے۔ پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو۔ اور انصاف کا خاص خیال رکھو۔ بیشک اللہ انہی کو پسند کرتا ہے جو انصاف کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان تمہارا صلح کرادینا ضروری ہے اور آپس کے تعلقات کا درست رکھنا لازمی اور قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہو تاکہ تم پر رحمت ہو۔"

(۱۰) فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا
لِأَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○
(تغابن۔ رکوع ۲)

سو جہاں تک تمہارے بس میں ہے یا تم سے ممکن ہو سکے، اللہ کے قانون سے ہم آہنگ رہو اور جو کچھ اللہ نے کہا ہے اس کو سنو اور فرمانبرداری کرو اور مال کو مفاد عام کے لئے کھلا چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور جان لو کہ وہی فلاح پائے گا جو اپنے نفس کے بخل اور حرص سے بچا رہے گا۔

(۱۱) وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ
بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ
اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال رکوع ۸)

اور ہاں ان کافروں کے مقابلے کے لئے، جہاں تک تمہارے بس میں ہے یا تم سے ممکن ہو سکے قوت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر اپنا ساز و سامان ہر وقت مہیا کئے رہو۔ کہ اس طور پر مستعد رہ کر تم خدا کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر ابھی نہیں ہے۔ اللہ البتہ انہیں جانتا ہے۔"

---

(۱) اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ
وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ
ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ
شَدِيدٌ (حدید رکوع ۳)

تم خوب اچھی طرح جان لو کہ مفاد عاجلہ پر نگاہ رکھنے والوں کی زندگی محض کھیل کود، ظاہری زیب و زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے۔ اس کی مثال بس یونہی ہے کہ جیسے مینہ، کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو تم اس کو زرد دیکھتے ہو۔ پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے، اور آخری انجام میں عذاب شدید ہے"

(۲) وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ
(رعد رکوع ۴)

اور یہ لوگ مفاد عاجلہ کی زندگی پر اترا رہے ہیں؟ حالانکہ مفاد عاجلہ کی زندگی آخری نتیجے کے مقابلہ میں بجز ایک متاع قلیل کے اور کچھ بھی نہیں۔"

(۳) زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ
وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ
الْمَآبِ ○ (آل عمران ع ۲)

انسانوں کے لئے مرد و عورت کے رشتے میں، اولاد میں، سونے چاندی کے ذخیروں میں، نشان زدہ گھوڑوں میں، مویشیوں میں، اور کھیتی باڑی میں، دل کا لگاؤ اور خوشنمائی رکھ دی گئی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہے، مفاد عاجلہ کی زندگی کی عارضی دلفریبیاں ہیں، بہتر مآل و انجام تو بس اللہ ہی کے قانون کے ساتھ ہے۔

(۴) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ
فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (ھود رکوع ۲)

جو کوئی صرف مفاد عاجلہ کی زندگی اور اس کی دلفریبیاں ہی چاہتا ہے تو ہم اس کی کوشش و عمل کے نتائج پورے پورے دیدیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ان معاملات میں اس کے ساتھ کمی کی جائے لیکن یاد رکھو کہ ایسے لوگ وہ ہیں جن کے لئے آخری انجام میں آگ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے عمل کیا ہے وہ آخری انجام میں محض بیکار ہوگا اور جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ سب اکارت جائے گا۔

---

(۱) وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ
كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (یونس ع ۲)

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو بے ساختہ پکارنے لگتا ہے، لیٹے بھی بیٹھے بھی، کھڑے بھی۔ پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ پھر اپنی پہلی حالت پر آ جاتا ہے اور اس طرح کہ جیسے، جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے اس نے ہم کو کبھی پکارا ہی نہ تھا، ان حد سے نکل جانے والوں کے اعمال ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں۔"

(۲) وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ
الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ○ (حٰمٓ سجدہ ع ۶)

اور جب ہم انسان کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ ہم سے منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو خوب لمبی چوڑی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔

(۳) يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ○ (بقرہ ۲۱)

اے لوگو! زمین میں جس قدر حلال اور پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے مہیا کر دی گئی ہیں شوق سے کھاؤ۔ (یہ جو لوگوں نے اپنے وہموں اور خیالوں سے طرح طرح کی کاوشیں اختیار کر رکھی ہیں تو یہ شیطانی وسوسے ہیں۔ تم) شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے ہی۔

اسلامی معاشرت
از پرویز ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے

مجلسِ اقبال

اب مثنوی کی تمہید شروع ہوتی ہے جس کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

راہ شب، چوں مہرِ عالمتاب زد　　گریۂ من بر رخِ گل، آب زد

اشکِ من از چشمِ نرگس خواب شست　　سبزہ از ہنگامہ ام، بیدار رُست

جب مہرِ عالمتاب نے رات کی تاریکیوں پر چھاپا مارا، اور صبح نمودار ہونے کو آئی تو میرے آنسوؤں نے پھولوں کا منہ دھلایا۔ نرگس کی آنکھ سے نیند کے خمار کو دور کیا۔ اور میرے آہ و نالہ کے ہنگامہ سے سبزۂ خوابیدہ بیدار ہو کر اُبھرا۔

مثنوی اسرارِ خودی اقبالؔ کا سب سے پہلا مرتب کلام ہے اور اس مثنوی کی تمہید کے پہلے ہی دو شعر اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ اقبالؔ کس طرح اپنے مقام اور پیام سے ابتدا ہی سے آگاہ تھا اس نے کس طرح اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ مبدا فیض نے اسے ایک اہم فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے صحنِ چمنِ کائنات میں بھیجا ہے، جہاں اس نے اپنی نغمہ سرائی اور تلخ نوائی سے ہر پھول اور شاخ کو شہیدِ جستجو بنا دینا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے فکر و عمل کی دنیا پر پوری طرح سے تاریکی مسلط تھی اور کسی طرف سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ عین اس زمانے میں، غلام آباد ہند میں اقبالؔ پیدا ہوتا ہے اور اپنے پیغامِ حیات بخش سے ساری فضا کو مرتعش کر جاتا ہے۔ آج پاکستان میں بالخصوص اور باقی دنیائے اسلام میں بالعموم، فکرِ جدید کی جو رو نظر آ رہی ہے، یہ اسی حکیم الامت کی جگر کاوی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اقبالؔ نے اس حقیقت کو قرآن کے غائر مطالعہ سے پایا تھا اس لئے اسے پہلے دن سے اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوا ہے جب فکر کی دنیا سے جمود و تقلید کی تاریکیاں چھٹ جانے کو ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے اس حقیقت کے احساس میں بھی کوئی دشواری نہیں پیش آئی کہ اس انقلابی دور میں اس کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوا ہے کہ وہ صدیوں سے محوِ خواب مسلمان کے لئے بانگِ اذاں بنے اور اسے "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے نعرۂ حیات آور سے، پھر سے زنداں کی دنیا میں لے آئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے مثنوی کی تمہید کے مندرجہ صدر دو اشعار میں بیان کیا ہے۔ یعنی اپنا مقام اور پیام۔ جہاں تک اس پیام کے اثر کا تعلق ہے، آنے والے زمانے نے بتا دیا کہ یہ الفاظ فی الواقعہ نوائے سروش تھے۔ دنیا میں جس قدر مقبولیت اقبالؔ کے پیام کو ہوئی ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور ملے۔ اور یہ مقبولیت ہوتی کیوں نہ؟ اقبالؔ نے افسانوی دنیا کے لفظی گورکھ دھندے نہیں پیش کئے تھے۔ اس نے زندگی کے تیز و گرم حقائق پیش کئے تھے جن کی بنیاد قرآن کی محکم تعلیم پر تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے تمہید کے تیسرے شعر میں بیان کیا ہے کہ

باغباں زورِ کلامم آزمود　　مصرعے کارید و شمشیرے درود

باغباں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ میری مضمر صلاحیتوں میں کس قسم کی ممکنات پوشیدہ ہیں اور میں اس اہم فریضہ کی سرانجام دہی کے قابل ہوں بھی یا نہیں جسے میرے سپرد کیا جا رہا ہے میرے زورِ کلام کو آزمایا۔ اس مقصد کے لئے اس نے میرے ایک مصرعہ کو زمین میں بویا تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ اس تخمِ نرم و نازک سے شمشیرِ خارا شگاف اُگ رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مستقل اقدار کا بیج، توتوں کے پھل لاتا ہے۔ اس سے وہ شجرِ طیب پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء" جس کی جڑیں پاتال میں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب باغبانِ چمنِ کائنات نے میرے ممکنات کا اس طرح اندازہ کر لیا تو

در چمن جز دانۂ اشکم نکشت　　تار افغانم بپودِ باغ رشت

اس نے اس باغ میں میرے گریۂ سحری کے تابندہ قطرات کے علاوہ اور کوئی بیج نہ بویا۔ اور میرے نالۂ نیم شبی کے تانے کو باغ کے بانے میں بُن کر اس سے ناموسِ ملت کے لئے شرف و مجد کی نئی چادر تیار کی۔ باغبانِ صحنِ کائنات کی اس ذرہ نوازیوں کا صدقہ ہے کہ

ذرہ ام مہرِ منیر آنِ من است　　صد سحر اندر گریبانِ من است

اگرچہ میں ایک ذرۂ ناچیز ہوں لیکن مہرِ عالمتاب میری ملک ہے (یا پوری کائنات کو روشن کر دینے والا آفتاب، میرا ایک لمحہ ہے۔ آں کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں)۔ اور ایک سحر کیا۔ میرے گریبان کے اندر سینکڑوں آئینہ پاش صبحیں پوشیدہ ہیں۔ اس گریبان کے چاک ہونے کی دیر ہے، "یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است　　محرم از نازادہائے عالم است

اگرچہ میں بظاہر ایک پیکرِ آب و گل ہوں لیکن میری مٹی، جامِ جم سے بھی زیادہ روشن ہے۔ جامِ جم میں تو صرف موجود دنیا کی جھلک ہی دکھائی دیا کرتی تھی۔ میری نگاہ ان رموز و اسرار عالم سے بھی واقف ہے جو ابھی پردۂ کتم میں ہیں اور عالمِ شہود میں نہیں آئے۔ اس لئے کہ میری بصیرت اس خدائے علیم و خبیر کی وحی سے مستنیر ہے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

فکرم آں آہو سر فتراک بست　　کو ہنوز از نیستی بیروں نجست

میری فکر اس آہو کو بھی شکار کر لیتی ہے جو ابھی پردۂ عدم سے باہر نہیں آیا۔ اور

سبزہ نا رُوئیدہ زیبِ گلشنم　　گل بشاخ اندر، نہاں در دامنم

میرے گل کدۂ فکر و بصیرت کی زیبائش اس سبزے سے ہو رہی ہے جو ابھی زمین سے پھوٹا بھی نہیں اور میرا دامن ان پھولوں سے رشکِ بہار بن رہا ہے جو ابھی شاخ کے اندر محوِ خواب ہیں۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ اقبالؔ غیب کے علم کا مدعی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جو شخص وحی کی روشنی میں کارگہِ کائنات پر غور و فکر کرتا ہے اس کے سامنے وہ حقیقتیں بے نقاب ہو جاتی ہیں جو دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے یکسر مستور ہوتی ہیں۔ ایک موسم شناس محض ہوا کے رُخ سے آنے والے طوفان کا پتہ دے دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں سب کچھ خدا کے مقرر کردہ غیر متبدل قوانین کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے جو دیدہ ور ان قوانینِ خداوندی کو سمجھ لیتا ہے اس کے لئے اسبابِ علل (CAUSE) سے نتائج (EFFECT) کا پتہ دے دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک طبیبِ حاذق کے لئے اس کا حکم لگا دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ اس دوا کا اثر یہ ہوگا۔ اسی لئے اقبالؔ نے کہا تھا کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اقبالؔ نے "آئینۂ ادراک" کہہ کر اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ اس مستقبل شناس کا تعلق فکر و شعور کی بنا پر ہے۔ کسی قسم کی لاہوتی "غیب دانی" کی بنا پر نہیں۔

آپ طلوعِ اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

اپنے احباب کو طلوعِ اسلام کا خریدار بنایئے۔

اپنے شہر میں طلوعِ اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔

کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر منگائے

اپنے علاقے سے طلوعِ اسلام کیلئے
اشتہار مہیا کیجئے

طاہرہ کے نام

نہیں بیٹا! اس میں تمہارا قصور نہیں جب ہمارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو۔ تو اس سے غیر متاثر رہنا اگرنا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس کے سامنے ایک مملکت کا وزیر اعظم اور اس کا ادنیٰ سا چپراسی دونوں برابر ہیں (میں نے چپراسی کو ادنیٰ سا محض وزیر اعظم کے تقابل کے لحاظ سے لکھا ہے۔ ورنہ قرآنی معاشرے میں تقسیم کار کے اعتبار سے ادنیٰ اور اعلیٰ کی تمیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں نظام ملت کے مختلف فرائض مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور کوئی ایک دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمہارے سپرد ادنیٰ درجہ کا کام ہوا ہے اس لئے تم ادنے ہو اور میرے ذمہ اعلیٰ درجہ کا کام ہوا ہے۔ اس لئے میں اعلیٰ ہوں۔ وہاں ادنیٰ اور اعلیٰ کا معیار یہ ہے کہ جو ان فرائض خداوندی کی تکمیل بطریق احسن کرتا ہے۔ وہی سب سے اعلیٰ اور واجب التکریم ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ) البتہ ہمارے موجودہ معاشرے میں ہوتا یہ ہے کہ جو کام ایک بڑا آدمی کرتا ہے (یعنی جو کسی بڑے منصب پر سرفراز ہوتا ہے) اس کا چرچا عام ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے لوگ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن جہاں تک قرآنی فیصلے کا تعلق ہے۔ اس کا اطلاق بڑے اور چھوٹے سب پر یکساں ہوتا ہے۔ قرآن میں نکاح و طلاق کے جس قدر احکام ہیں۔ ان کا اطلاق ایک بادشاہ پر بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح ایک مزدور پر۔ اس میں (تمہارے الفاظ میں) "وزیر اعظم اور نتھو چمار" میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اب اصل بات کی طرف آؤ۔ وحدتِ ازدواج (MONOGAMY) اور تعدد ازدواج (POLYGAMY) کا مسئلہ (یعنی ایک مرد کی بیک وقت ایک ہی بیوی ہو سکتی ہے یا ایک سے زیادہ) قوموں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تم تاریخ کی کتابوں میں دیکھو۔ اس بات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہوگا کہ فلاں قوم وحدت ازدواج کے مسلک پر کاربند تھی۔ اور فلاں تعدد ازدواج کی قائل۔ اس سے قوموں کی تہذیب، تمدن اور فکر و عمل پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر تہذیب کے کسی مورخ کو کسی پرانی قوم کے متعلق یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان کا ازدواجی مسلک کیا تھا تو وہ اس قوم کے متعلق بڑی بڑی دور رس باتوں کا اندازہ لگا لے گا۔ یہ ہے اس مسئلہ کی اہمیت۔

اب دوسری طرف قرآن کریم کے متعلق ہمارے دعووں کو دیکھو تو ہر شخص یہ کہتا ہوا سنائی دے گا کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس میں نوع انسانی کی معاشرتی، معاشی، اقتصادی، عمرانی، سیاسی، عائلی، اجتماعی، انفرادی زندگی کے متعلق مکمل اور بے مثل و بے نظیر راہ نمائی موجود ہے اور وہ تمام انسانی مسائل کا پورا پورا حل اپنے اندر رکھتا ہے، یہ ہوئی اس کتاب کی اہمیت، اب ظاہر ہے کہ جو ضابطہ حیات اس قدر مکمل ہو، اسے وحدت اور تعدد ازدواج جیسے اہم مسئلہ کے متعلق تو صاف اور واضح راہ نمائی دینی چاہیئے۔ اگر وہ انسانی زندگی کے ایسے اہم سوال کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیتا یا اگر فیصلہ دیتا ہے تو وہ ایسا مبہم ہے کہ جس کا جو جی چاہے اس سے مطلب نکال لے۔ تو ایسی کتاب کے متعلق "مکمل اور بے مثل و بے نظیر ضابطہ حیات" ہونے کا دعوے جو حقیقت رکھ سکتا ہے۔ وہ ظاہر ہے لیکن ہمارے ہاں اس مسئلہ کے متعلق جو بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس ضمن میں ہمارے سامنے کوئی متعین اور واضح فیصلہ نہیں ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ قرآن نے اس باب میں کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ یا اگر فیصلہ دیا ہے تو وہ (خدانکردہ) مبہم اور غیر متعین ہے۔ قرآن نے تو صاف اور واضح فیصلہ دیا ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم قرآن کو ہمیشہ ان خیالات کے تابع رکھتے ہیں جو ہمارے ذہن میں کسی نہ کسی طرح پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب ہم قرآن کی طرف اس طرح رجوع کریں گے تو جو راہ نمائی ہم وہاں سے حاصل کریں گے۔ وہ قرآن کی راہ نمائی نہیں ہوگی بلکہ ہمارے اپنی خیالات کی ترجمانی ہوگی۔ جنہیں لے کر ہم قرآن کی طرف گئے تھے۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں۔ قرآن کی طرف اس طرح رجوع کرنا شرک جلی اور جرم عظیم ہے شرک اس لئے کہ اس طرح ہم جس راہ نمائی کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت غیر خدائی راہ نمائی ہوتی ہے۔ اور جرم عظیم اس لئے کہ اس سے ہم اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا رکھتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی ایک خط میں لکھا تھا کہ تعدد ازدواج کے متعلق سارے قرآن میں صرف ایک آیت ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳) اس پر غور کرو طاہرہ! کہ قرآن کا یہ دعوےٰ ہو کہ وہ صاف اور واضح زبان (عربی مبین) کی کتاب ہے۔ اور اس میں کسی معاملہ کے متعلق صرف ایک آیت ہو (یعنی صورت یہ بھی نہ ہو کہ اس معاملہ کے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ اس لئے ان سب کو یکجا سامنے رکھ کر معانی متعین کرنے میں دشواری ہوتی ہے) تو کیا اس پر بھی اس معاملہ کے متعلق قرآن سے متعین اور واضح راہ نمائی نہیں مل سکے گی؟ اس آیت کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ

> اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ تم یتامیٰ کے معاملہ میں انصاف نہیں کر سکو گے تو تم النساء میں سے حسب پسند دو دو، تین تین، چار چار، تک اپنے نکاح میں لے آؤ۔ لیکن اگر تمہیں اس کا خوف ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے۔ تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔

سوال یہ ہے کہ یہاں یتامیٰ سے کون مراد ہیں۔ اور وہ النساء جن سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے کون ہیں؟

عربی زبان میں یتیم کے بنیادی معنی ہیں تنہا، اکیلا، جس بچے کا باپ مر جائے اسے بھی یتیم کہتے ہیں۔ اگر وہ بچہ لڑکا ہو تو بالغ ہو جانے کے بعد اسے یتیم نہیں کہتے۔ لیکن اگر وہ لڑکی ہو۔ تو اس کے متعلق لغت میں ہے کہ جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، اسے یتیم ہی کہا جائے گا۔ خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو جائے۔ تاج العروس عربی زبان کی بڑی مشہور اور مستند لغت ہے۔ اس میں شعراء کے کلام کی سند کے ساتھ ائمہ لغت کے اقوال بھی دیئے ہیں۔ جن میں وضاحت سے لکھا ہے کہ جب تک اس لڑکی کی شادی نہ ہو جائے اسے یتیم ہی کہا جائے گا۔ عربی کی دوسری مستند لغت، لسان العرب میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہتے ہیں۔ جس کا خاوند نہ ہو، خود سورۂ نساء میں دوسرے مقام پر یتٰمی النساء (۴/۱۲۷) کی اصطلاح آئی ہے۔ "یتیم عورتیں" یعنی وہ عورتیں جن کا خاوند نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ مندرجہ صدر آیت میں یتامیٰ کے معنی ہوں گے۔

(۱) ایسے نابالغ بچے (لڑکے اور لڑکیاں) جن کے باپ مر چکے ہوں۔ اور

(۲) ایسی بالغ (شادی کے قابل) یتیم لڑکیاں جن کی شادی نہ ہوئی ہو نیز بیوہ عورتیں۔

لہٰذا قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر تمہارے معاشرے میں ایسی صورت پیدا ہو جائے (مثلاً جنگ کی وجہ سے) کہ مرد ضائع ہو جائیں۔ اور یتیم بچے اور شادی کے قابل بالغ لڑکیاں اور بیوہ عورتیں بکثرت رہ جائیں۔ اور اس طرح یہ خطرہ لاحق ہو جائے کہ ان کے حقوق و واجبات پورے نہیں ہو سکیں گے۔ تو اس ہنگامی صورت کا علاج یہ ہے کہ

> ان میں سے جو عورتیں (النساء) تمہیں پسند آئیں، ان سے چار کی حد تک شادی کر لو۔

یہاں النساء کا لفظ آیا ہے، ظاہر ہے کہ

(۱) وہ بالغ یتیم لڑکیاں جو شادی کی عمر تک پہنچ چکی ہیں النساء میں داخل ہیں اور

(۲) وہ بیوہ عورتیں جن کے یتیم بچے رہ گئے ہیں۔ وہ بھی النساء میں داخل ہیں۔

لہٰذا علاج یہ بتایا گیا ہے کہ یتامیٰ کے اس گروہ میں سے جو یتیم لڑکیاں شادی کے قابل ہوں۔ یا بیوہ عورتیں۔ انھیں حسب پسند (چار کی حد تک) اپنے نکاح میں لے آؤ۔ اور اس طرح "ان تنہا رہ جانے والے" خانماں برباد افراد کو اپنے اپنے خاندانوں کا جزو بنا لو، بشرطیکہ تم ان میں عدل کر سکو اگر عدل نہ کر سکو تو اس کی بھی اجازت نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ

(ا) ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت صرف اسی وقت ہے۔ جب معاشرہ میں یتیم بچے اور شادی کے قابل یتیم لڑکیاں اور بیوہ عورتیں خطرہ کا موجب بن جائیں۔ اور

(ب) یہ شادی ان قابل نکاح یتیم لڑکیوں یا بیوہ عورتوں سے کی جائے۔

طاہرہ! تم سورۂ النساء کی مندرجہ صدر آیت اور تصریحات بالا پر اچھی طرح غور کرو اور سوچو کہ اس آیت کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں کوئی دقت بھی پیش آتی ہے۔ اور یہ بھی سوچو کہ مندرجہ بالا صورت کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہے۔ جس میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی گئی ہو؟ کیا تمہیں قرآن کی اس راہ نمائی میں کوئی ابہام، کوئی اغلاق یا کوئی پیچیدگی نظر آتی ہے؟ قرآن کی یہ راہ نمائی کسی ایک فرد کے لئے نہیں۔ بلکہ اس ساری کی ساری قوم کے لئے ہے۔ جو

قرآن پر ایمان رکھتی ہے۔ پھر یہ حکم صرف مردوں کے لئے نہیں بلکہ عورتوں کے لئے بھی ہے۔ یعنی جس طرح کسی مرد کو یہ اجازت نہیں کہ (ان خاص ہنگامی حالات کے علاوہ) اور کسی حالت میں ایک سے زیادہ شادی کرے۔ اس طرح کسی مسلمان عورت کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ ان ہنگامی حالات کے علاوہ کسی مرد کی ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے نکاح کرلے۔ اسلام میں عورت کی مرضی کے بغیر نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا (ان ہنگامی حالات کے علاوہ) ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا مجرم اگر مرد ہے تو وہ عورت جو اس مرد کے نکاح میں آجانا پسند کرتی ہے وہ بھی قرآن کی رو سے مجرم ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں تم ذرا ان ہنگاموں پر غور کرو جو پچھلے دنوں سے یہاں برپا ہو رہے ہیں۔ اور جن سے متاثر ہو کر تم نے اس مسئلہ کے متعلق دوبارہ دریافت کیا ہے۔ پہلے تم اپنی ہم جنس بہنوں کو دیکھو جو اس قدر نعل بر آتش ہو رہی ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ کہا ہے کہ قرآن کی رو سے ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت صرف ان ہنگامی حالات میں ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے؟ اس کی بین وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان احتجاج کرنے والیوں کو خود بھی علم نہیں کہ اس باب میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن غیر شعوری طور پر شاید یہ بھی وجہ ہو کہ ان میں سے کئی ایک ایسی ہیں جو اپنے مردوں کی پہلی بیوی کی موجودگی میں ان کے نکاح میں آئی ہوئی ہیں۔ پھر ان کا احتجاج بھی وزیر اعظم (محمد علی صاحب) کے خلاف ہے کہ انھوں نے دوسری شادی کیوں کی۔ ان کی اس نئی بیوی کے خلاف نہیں کہ وہ ان کے نکاح میں کیوں آئیں؟ حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے خود ایک ریزولیشن پاس کیا تھا کہ اس قسم کی "بسے گھروں کو اجاڑنے والی" (   ) کا بائیکاٹ کیا جائیگا! اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف ان کا مطالبہ یہ ہو کہ ایسی حالت میں دونوں بیویوں میں عدل کرنا چاہیئے۔ اور دوسری طرف ان کا مطالبہ یہ ہو کہ وزیر اعظم کو چاہیئے کہ مملکت کی "بیگم اول" کی قانونی حیثیت اپنی پہلی بیوی ہی کو دیں! کیا دو بیویوں میں عدل اسی کو کہتے ہیں۔؟

تم نے دیکھا بیٹی! کہ ہم میں سے جو احتجاج کرنے کے لئے بھی اٹھتا ہے، اس کا احتجاج محض ہنگامی جذبات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد نہ علم و بصیرت پر ہوتی ہے۔ نہ قرآنی احکام پر۔ اسی ضمن میں اس مسودۂ قانون کو بھی دیکھو جو ایک محترمہ بہن (بیگم تصدق حسین) کی طرف سے پنجاب اسمبلی میں پیش ہوا ہے۔ اس مسودہ کی تمہید میں ہمیں یہ روح پرور اور بصیرت افروز توجیہ ملتی ہے۔

> ہرگاہ یہ امر قرین مصلحت ہے کہ اسلامی قانون کے احکام متعلقہ شادی، انفساخ نکاح، طلاق، مہر اور حضانت کو قرآنی قوانین کی روح کے مطابق بنانے کے پیش نظر مجتمع کیا جائے۔ اور ان کی وضاحت کی جائے۔

یہ توجیہ اس اعتبار سے روح پرور اور بصیرت افروز ہے۔ کہ اس "اسلامی مملکت" میں کسی کو اتنی توفیق تو ارزاں ہوئی کہ موجودہ قوانین کو تبدیل کرتے وقت اس نے "قرآنی قوانین" کا نام لیا۔ ورنہ یہاں قرآن کا نام اس قدر شجر ممنوعہ قرار دیا جا رہا ہے کہ انسان اسے زبان تک لاتے وقت دائیں بائیں دیکھتا ہے کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود اس توجیہ میں ایک بڑا نقص ہے۔ جن معاملات میں قرآن نے صرف اصول دیئے ہیں۔ ان کے متعلق تو یہ کہنا ٹھیک ہوتا ہے کہ ہمیں ایسے قوانین بنانے چاہئیں جو ان اصولوں کی روح کے مطابق ہوں۔ لیکن جن معاملات میں قرآن نے خود قوانین مرتب کر دیئے ہیں ان کی بابت یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ ہمیں ان معاملات کو "قرآنی قوانین کی روح" کے مطابق بنانا چاہیئے۔ ایسے معاملات کو قرآنی قوانین کی روح نہیں بلکہ عین قرآنی قوانین کے مطابق بنانا ہی شرط اسلام ہے۔

اب اصل مسودہ کی طرف آؤ۔ اس میں پہلی شق یہ ہے کہ کوئی مرد عدالت کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ قرآن کی رو سے دوسری شادی کی اجازت صرف ان ہنگامی حالات میں مل سکتی ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ ایسے ہنگامی حالات موجود ہیں نظام ہی کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ افراد از خود اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔

لیکن اس کے بعد مسودہ میں ہے کہ کوئی عدالت کسی مرد کو دوسری شادی کی اجازت دینے کی مجاز نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ وہ شخص عدالت کو مطمئن نہ کر سکے کہ

(۱) اس کی بیوی دس سال کے عرصہ سے بانجھ ہے (پہلے "متعدی مرض" کی شرط تھی جسے بعد میں صرف بانجھ پن کی شرط سے منسلک کر دیا گیا ہے)۔

(۲) یا وہ فاتر العقل ہے

(۳) اور وہ اس کے ذرائع آمدنی دونوں بیویوں اور اس کے اور اس کے بچوں کے کفیل ہو سکتے ہیں۔ یا کہ

(۴) وہ دونوں بیویوں سے برابر کا انصاف روا رکھ سکتا ہے اور یکساں محبت کا برتاؤ کر سکتا ہے۔

تم نے دیکھا طاہرہ! ہماری یہ محترمہ بہن جو نکاح کے معاملات کو قرآنی قوانین کے مطابق بنانے کی مبارک آواز لے کر اٹھی تھیں۔ بانجھ پن کو دوسری شادی کے لئے وجہ جواز قرار دینے میں کس طرح قرآن سے ہٹ گئیں! قرآن نے ایک سے زیادہ شادی کے لئے صرف ایک ہی وجہ جواز بتائی ہے یعنی معاشرہ میں یتیموں اور بیواؤں کی ایسی کثرت ہو جائے کہ ان کے حقوق پورے کرنے کے لئے کوئی اور صورت باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ ہم جتنی اور وجوہات پیدا کریں گے۔ وہ خود ہمارے اپنے دماغ یا قلب کی پیدا کردہ ہوں گی۔ خدا کی سند ان کے ساتھ نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس مسودہ میں مجوزہ تبدیلی بھی اسی طرح غیر قرآنی رہے گی۔ جس طرح موجودہ قانون غیر قرآنی ہے۔

ضمناً اتنا بھی سمجھ لو کہ دو بیویوں سے "یکساں محبت" کا مطالبہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے اور اسی لئے قرآن اسے ناممکن العمل قرار دیتا ہے۔ وہ صرف اس کا مطالبہ کرتا ہے کہ تم ایسا نہ کرو کہ ایک ہی بیوی کی طرف یکسر جھک جاؤ۔ اور دوسری بیوی ادھر لٹکتی ہوئی رہ جائے فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴/۱۲۹)

لیکن اگر ہماری اس محترم بہن نے قرآن کی صحیح تعلیم کو نہیں سمجھا (کہ تعدد ازدواج کی اجازت صرف یتامیٰ اور بیوگان تک محدود ہے) تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو اس پر ہو کہ ہمارے ہاں کے "علماء" بھی اسی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر مسودہ پر بحث کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی، محترم امین احسن اصلاحی صاحب ازدواج کی مختلف صورتیں حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> (۱) بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے خاندان کے نظم کو سنبھالنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ مثلاً ایسے بچوں کا باپ مر جاتا ہے جن کی ولدیت کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مرد بچوں کی ماں کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لے۔ کیونکہ بیوہ کے نکاح نہ کرنے میں بھی اندیشہ ہے اور کسی غیر جگہ نکاح کرنے میں بھی بچوں کے حقوق تلف ہونے اور ماں کی محبت سے محروم ہو جانے کا ڈر ہے۔
>
> (۲) اسی طرح بے شمار صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص کا مقصد ازدواج ایک عورت سے پورا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن نہ تو وہ خود اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لئے تیار ہے۔ اور نہ اس کی بیوی ہی طلاق لینے کے لئے تیار ہے۔
>
> (۳) علیٰ ہذا القیاس اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص ایک عورت سے پوری جنسی تسکین حاصل نہ کر پاتا ہو۔ اور وہ مزید کسی نکاح کی ضرورت محسوس کرے
>
> (۴) اجتماعی اور معاشرتی ضرورت کی مثالیں ہم اوپر انگلستان اور یورپ کے حالات سے پیش کر چکے ہیں (یعنی مردوں کی کمی)
>
> (۵) الغرض اس کی اتنی شکلیں ممکن ہیں۔ اور اس کے اتنے واضح اور غیر واضح اسباب ہو سکتے ہیں کہ قانون کے لئے ان سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔
>
> (ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۵۵ء)

ان شکلوں میں سے علاوہ ۴ کے تو ایسی شقیں ہیں جو قرآن کی اجازت کے دائرے میں آسکتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ باقی جس قدر شقیں بتائی گئی ہیں (اور جس قدر "ممکن شکلیں" بغیر بتائے چھوڑ دی گئی ہیں) ان کے لئے سند کیا ہے؟ یہ سوال طاہرہ بیٹی! دین کا اہم سوال ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ اگر قرآن تعدد ازدواج کو خود مشروط نہ کر دیتا۔ اور صرف اتنا کہہ دیتا کہ "جب حالات کا تقاضا ہو تو تم چار تک نکاح کر سکتے ہو" تو ہمیں اس کی اجازت تھی کہ ہم اس اصول کے ماتحت سینکڑوں شکلیں متعین کر لیتے۔ اور ضروریات کے مطابق ان میں رد و بدل اور حک و اضافہ بھی کرتے رہتے لیکن جب قرآن تعدد ازدواج کی اجازت کو (ان خفتم الا تقسطوا فی الیتمیٰ) کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا۔ تو ہمیں یہ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم ایک شکل کے ساتھ سو شکلوں کا خود اضافہ کر لیں! اس میں شبہ نہیں کہ دین کی جزئیات متعین کرنے میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے لیکن یہ اجازت وہیں ہے۔ جہاں قرآن نے خود کسی بات کو متعین نہیں کر دیا۔ یہ بات ایک مثال سے

واضح ہو جائے گی۔ قرآن نے لحم خنزیر (سؤر کے گوشت) کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ ایک متعین حکم ہے۔ اب اگر ہم اس حکم کے بعد اس طرح قیاس (اجتہاد) شروع کر دیں کہ

(۱) سؤر کو اس لئے حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ غلاظت کھاتا ہے۔ اور

(۲) بھیڑ بھی غلاظت کھاتی ہے۔ اور مرغی بھی۔ اس لئے

(۳) بھیڑ اور مرغی بھی حرام ہے۔

تو یہ اجتہاد نہیں بلکہ خدا کی متعین کردہ حرام اشیا کی فہرست میں اضافہ ہوگا۔ جس کا ہمیں کوئی اختیار نہیں۔ اگر قرآن صرف اتنا کہتا کہ "غلاظت کھانے والے جانور حرام ہیں" تو قرآنی نظام کو اس کی اجازت تھی کہ وہ ان جانوروں کی فہرست مرتب کرتا۔ اور نئی نئی باتیں سامنے آنے سے اس فہرست میں ضروری تبدیلیاں بھی کرتا رہتا۔ تعدد ازدواج کی اجازت قرآن نے صرف ایک شکل میں دی ہے ہم اس میں اور شکلوں کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اس شکل (یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ انصاف) کے پہلو مختلف ہو سکتے ہیں (مثلاً کہیں یہ صورت جنگ میں مردوں کے ضائع ہو جانے سے پیدا ہوگی۔ اور کہیں قوم میں پیدائشی طور پر لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اس صورت میں یتامیٰ کے ذیل میں وہ تمام لڑکیاں آ جائیں گی جو شادی کے قابل ہوں۔ لیکن انہیں خاوند نہ ملتے ہوں۔ کہیں یہ صورت کسی ایک خاندان میں رونما ہوگی۔ اور کہیں پوری کی پوری قوم کو محیط ہو جائے گی) ہم ان مختلف پہلوؤں کے متعلق تو اجتہاد سے کام لے سکتے ہیں (کہ کہاں قرآنی اجازت کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اور کہاں نہیں) لیکن قرآن کی بتائی ہوئی بنیادی شرط میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ ہمارا اجتہاد اس بنیادی شرط سے ملتے جلتے حالات کے دائرے کے اندر محدود رہے گا۔ نئی شرائط کو اس دائرے کے اندر نہیں لا سکیگا ہمارے ہاں اصل خرابی یہ ہے کہ ہم قرآن کے مقید کو مطلق اور مقید کو مطلق کر لیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان الفاظ کو پڑھ کر تم پکار اٹھو گی کہ لو! چچا ابا نے پھر اسی "لاہوتی زبان" میں گفتگو شروع کر دی (تم لاہوتی زبان" کا طعن ایک دفعہ سلیم میاں نے دیا تھا۔ میں نے اسی کے الفاظ دہرا دیئے ہیں اس لئے کہ تم "مقید و مطلق" کے معنی اس سے پوچھو گی۔ اور وہ جھٹ سے اسے "لاہوتی زبان" کہہ دیگا) لیکن ریمارک پاس کرنے میں اتنی عجلت سے کام نہ لو۔ اگلا فقرہ تو دیکھ لو۔ مطلق کے معنی ہیں ایسا کھلا ہوا اصولی حکم جس کی جزئیات و شرائط قرآن نے خود متعین نہ کی ہوں۔ اور مقید کے معنی ہیں ایسا حکم جسے متعین طور پر بیان کر دیا گیا ہو۔ قرآن نے تعدد ازدواج کی اجازت کو "یتامیٰ" کی شرط کے ساتھ مقید کیا تھا۔ لیکن ہم نے قرآن کی عائد کردہ قید کو اٹھا کر اس حکم کو مطلق بنا دیا۔ یعنی اسے افراد کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ کہ جس وقت کوئی اپنے لئے ضرورت سمجھے دوسری شادی کر لے۔ اسے کہتے ہیں قرآن کے مقید کو مطلق بنا دینا۔ اور یہ ہے ہمارے ہاں کی بنیادی خرابی (میں نے تمہیں سمجھانے کی خاطر مطلق اور مقید کا لغوی مفہوم بیان کیا ہے۔ ورنہ یہ فقہ کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جن کی تفصیل لمبی چوڑی ہے)

اب میں تمہارے خط کے اس حصہ کی طرف آتا ہوں جس میں تم نے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ اور صحابہؓ کے ہاں بھی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ اس ضمن میں اس اصولی بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ نبی اکرمؐ قرآن پر عمل کرنے اور عمل کرانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ لہٰذا ہم ایک ثانیہ کے لئے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ حضورؐ کا کوئی عمل یا ارشاد (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف ہوگا اگر ہمیں تاریخ میں کہیں کوئی بات ایسی ملتی ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ عام طور پر تاریخ میں یہی ملتا ہے کہ رسول اللہؐ کی نو ازدواج مطہرات تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نو کی تعداد مجموعی تھی (یعنی یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے کل تعداد نو تک پہنچی تھی) لیکن ایک وقت میں حضورؐ کی بیوی ایک ہی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ قرآن کے مندرجہ بالا حکم کے مطابق حضورؐ کی ازواج مطہرات ایک وقت میں چار سے زیادہ نہ تھیں۔ لیکن اگر یہ درست ہو کہ بیک وقت حضورؐ کی ازواج مطہرات کی تعداد نو تھی، تو اسے ماننا پڑے گا کہ یہ شادیاں قرآن کے حکم آنے سے پہلے، عرب کی عام معاشرت کے مطابق ہوئی ہونگی۔ اس قسم کی ایک اور مثال ہمارے سامنے ہے۔ قرآن میں حکم ہے کہ مسلمان عورت کی شادی غیر مسلم کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ لیکن حضورؐ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں اپنے خاندان کے ان لڑکوں کے ساتھ کی تھیں، جو مسلمان نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ شادیاں قرآن کا حکم آنے سے پہلے عرب کی عام معاشرت کے مطابق عمل میں آئی تھیں، قرآن کا حکم آ جانے کے بعد حضورؐ کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اسی طرح اگر یہ درست ہو کہ حضورؐ کی ازواج مطہرات کی تعداد بیک وقت نو تھی۔ تو یہ چیز قرآن کا حکم آنے سے پہلے کی ہو سکتی ہے۔ بعد میں دیکھا جاتا ہے کہ قرآن کا یہ حکم فتح مکہ کے قریب سنہ ھ میں نازل ہوا تھا۔ اور حضورؐ کا آخری نکاح سنہ ھ میں ہوا تھا۔ اس ضمن میں عزیزہ! اس امر کا

کے حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ

(۱) مسلمانوں کا ایک مختصر سا معاشرہ تھا۔

(۲) اس جماعت کی پوری زندگی مسلسل لڑائیوں میں بسر ہو رہی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضورؐ کی دس سالہ مدنی زندگی میں مسلمانوں کو چھوٹی بڑی اسی لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں۔

(۳) قرآنی حکم کے مطابق ایک مسلمان عورت کی شادی صرف مسلمان مرد سے ہو سکتی تھی۔ کافر و مشرک تو ایک طرف اس کی شادی کسی اہل کتاب کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ وہ مسئلہ جسے قرآن نے "یتامیٰ" سے تعبیر کیا ہے (یعنی ان بچوں کا مسئلہ جن کے باپ مارے گئے ہوں اور ان عورتوں کا مسئلہ جو بلا خاوند کے رہ گئی ہوں) بڑی نزاکت اختیار کر گیا ہوگا۔ اس نازک حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے قرآن نے تعدد ازدواج کا ہنگامی علاج تجویز کیا تھا۔ لہٰذا قرآن کے اس حکم کے بعد جہاں جہاں بھی ایک سے زیادہ نکاح ہوا ہوگا۔ وہ اسی ہنگامی ضرورت کے ماتحت ہوا ہوگا۔ جن مقاصد کو ہم آج دوسری شادی کے لئے وجہ جواز بناتے ہیں اس زمانہ میں ان کی بنا پر دوسری شادیاں نہیں ہوئی ہوں گی مثلاً ہمارے ہاں عام طور پر عورت کے بانجھ پن کو دوسری شادی کے لئے ایسی معقول وجہ سمجھا جاتا ہے کہ اس پر شاید ہی کوئی معترض ہوتا ہو۔ نبی اکرمؐ کے متعلق یہ واضح ہے کہ حضورؐ کی تمام اولاد (سوائے ایک لڑکے ابراہیم کے) حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد آپؐ نے جو شادیاں کیں۔ ان میں آپ کی ازواج مطہرات (ایک کے سوا) سب بانجھ تھیں۔ لیکن مجھے طاہرہ پوری تاریخ میں کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ملا جس میں حضورؐ نے یہ کہا ہو کہ چونکہ میری فلاں بیوی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ اس لئے میں ایک اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حقیقت خود اس امر کی شاہد ہے کہ حضورؐ کے زمانہ میں ایک سے زیادہ بیوی صرف ان ہنگامی حالات کی وجہ سے گھروں میں لائی جاتی تھیں۔ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان ہنگامی حالات کی شادیوں کو عام حالات میں (ایک سے زیادہ شادی کرنے کے لئے) بطور سند پیش کرنا بڑی زیادتی ہے۔

یہ ہے عزیزہ! قرآن کی رو سے ایک سے زیادہ بیویوں کی اصل پوزیشن۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب میں ہر مرد کو اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے حالات کی رو سے جب بھی ضروری سمجھے، دوسری، تیسری، چوتھی شادی کر لے۔ ان حالات میں دوسری شادی کرنے والے کو مورد ملامت بنانا غلط ہے۔ اس لئے جب کسی شخص کو یہ بتایا جاتا ہے کہ جس طرح مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے اس کی اجازت ہے کہ وہ چاہے تو دال سبزی کھائے اور چاہے گوشت کھائے۔ اسی طرح اسے اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ چاہے تو ایک بیوی پر اکتفا کرے اور چاہے تو چار تک شادیاں کرے۔ تو دوسری شادی کرنے میں وہ کوئی جھجک ہی محسوس نہیں کرے گا اس لئے اپنے آپ کو قابل ملامت نہیں سمجھے گا ان حالات کے ماتحت عزیز بیٹی! اس مرض کا علاج وعظ و نصیحت اور مظاہرات نہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تعدد ازدواج کے متعلق مسلمانوں کے موجودہ غیر قرآنی تصور کو قرآن کے مطابق بدلا جائے۔ لیکن یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم قرآن کو دین کی اساس سمجھیں۔ میری ساری عمر اسی ایک کوشش میں گذری ہے کہ میں اپنے بھائیوں تک اس حقیقت کو پہنچا سکوں اور میں انہیں بتا سکوں کہ دین اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور اس کی طرف سے دیا ہوا آخری اور مکمل دین اس کی کتاب (قرآن) کے اندر ہے جس دن مسلمان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا اس کے تمام امراض کا علاج ہو جائیگا۔ تم بھی بیٹی! اپنے حلقہ اثر میں اس آواز کو پہنچاتی جاؤ۔ اور اگر کہیں دور تک یہ آواز نہ پہنچا سکو تو کم از کم جاوید میاں (سلمہ اللہ تعالیٰ) کے دل کی گہرائیوں میں تو اسے ضرور نقش کر دو۔ تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اس تصور کو لے کر اٹھیں۔ اور آگے بڑھائیں۔ اگر تم نے یہ کر دیا تو میرے نالۂ نیم شبی اور دعائے سحری کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تمہاری آنکھوں کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھے۔

دعا گو

پرویز۔ ۴ مئی ۱۹۵۵ء

معراج انسانیت　از۔ پرویز

سیرت رسول اللہ قرآن کے آئینہ میں

قیمت۔ بیس روپے

حقائق وعبر

موجودہ تہذیب کا نوعِ انسان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو ان تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ جو باہمی ہمدردی، محبت، اخوت، غمخواری کے جذبات کے تقاضوں نے ایک دوسرے پر عائد ہوا کرتی تھیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

چنانچہ ہمارے معاشرہ میں آلات کی اس چکی میں قریب قریب سب پس چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو لوگ ذرا زیادہ "سخت جان" واقع ہوئے تھے۔ اور ان کا احساسِ مروت آلات کی چکیوں سے بچ نکلا تھا۔ وہ اب اور قسم کی معاشرتی رتھ کے پہیوں کے نیچے کچلے جا رہے ہیں۔ جن سے ان کے اس احساس کا زندہ رہ جانا ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ مثلاً باہمی تعاون کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہوا کرتی تھی کہ آپ کسی سے روپے کا نوٹ یا دس روپے کے چھوٹے نوٹ مانگ لئے۔ لیکن اب کیا ہوتا ہے؟ آپ سڑک پر چلے جا رہے ہیں کہ آپ کے نزدیک ایک موٹر آکر رکتا ہے۔ موٹر میں سے ایک نہایت "شریف آدمی" برآمد ہوتا ہے۔ اور ہاتھ میں ایک نوٹ لئے آپ کی طرف بڑھتا ہے۔ بڑھتا ہے۔ اور نہایت لجاجت سے کہتا ہے "چھوٹے نوٹ"! آپ کا احساسِ مروت اسے ادنےٰ سے تعاون کے لئے آپ کو رکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ جیب سے بٹوہ نکالتے ہیں، اتنے میں وہ آپ کے قریب آجاتا ہے وہ بڑا نوٹ آپ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، چھوٹے نوٹ نہایت پھرتی سے اندر پلٹتا ہے اور تیزی سے موٹر میں جا بیٹھتا ہے۔ موٹر فراٹے بھرتی آگے نکل جاتی ہے، اور جب آپ اپنے بٹوے کو دیکھتے ہیں۔ تو اس میں سے پچاس روپے کے نوٹ گم ہوتے ہیں۔

کیا آپ اس کے بعد بھی کسی کے بڑے نوٹ کے بدلے میں چھوٹے نوٹ دینے کے لئے تعاون کا ہاتھ بڑھائیں گے؟

یا مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہیں چوراہے پر دو آدمی آپس میں دھینگا مشتی کرتے دکھائی دیتے ہیں، ان میں ایک زیادہ طاقتور ہے جو کمزور آدمی کو دھائیں دھائیں پیٹتا چلا جاتا ہے۔ وہ کمزور آدمی مدد کے لئے چلاتا ہے۔ آپ کا تقاضائے ہمدردی آپ کو آگے بڑھاتا ہے آپ جا کر بیچ بچاؤ کر دیتے ہیں۔ وہ دونوں ایک طرف چلے جاتے ہیں، اور آپ اطمینان کا سانس لے کر دوسری طرف، لیکن چند ہی قدم کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ جیب سے آپ کا بٹوہ غائب ہے۔

کیا آپ اس کے بعد پھر بھی کسی مظلوم کی مدد کے لئے آگے بڑھیں گے؟

یا مثلاً آپ کہیں جا رہے ہیں کہ سامنے سے ایک نہایت معزز آدمی آپ کو دور سے دیکھ کر ہشاش بشاش ہو جاتا ہے اور ہاتھ بڑھاتا ہوا آپ کی طرف لپکتا ہے۔ آپ اسے پہچانتے نہیں لیکن دل میں خیال کرتے ہیں کہ کوئی بہت ہی قدیمی ملنے والا ہے جسے آپ جلدی میں پہچان نہیں سکتے۔ اتنے میں وہ آپ کے قریب آجاتا ہے۔ مصافحہ کرتا ہے۔ اور نہایت تپاک سے گلے ملتا ہے، بعد میں خود ہی معذرت کرتا ہے کہ معاف رکھئے! غلط فہمی ہو گئی۔ (جیسے ٹیلیفون پر آواز آیا کرتی ہے (SORRY WRONG NUMBER) آپ نہایت محبت اور سادگی سے جواب دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں۔ وہ دوسری طرف چلا جاتا ہے اور جب تھوڑی دور آگے جا کر آپ دوکاندار کو پیسے دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو جیب خالی پاتے ہیں۔

کیا آپ اس کے بعد عید کے دن بھی کسی سے گلے ملئے گا؟

یہ اور اس قسم کے اور واقعات ہیں۔ جنہیں مثال میں پیش کر کے محکمہ پولیس آئے دن اس قسم کی تنبیہات شائع کرتا رہتا ہے کہ اس قسم کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہنا۔

کہئے! معاشرے کے اس جھکڑ کے بعد بیچارے احساسات مروت و غمخواری کا کہیں ڈھونڈے سے بھی نشان ملے گا؟

اس کی وجہ ۔۔۔ وہی معاشی ناہمواریاں اور غلط تعلیم و تربیت!!

اور اس کا علاج ۔۔۔ وہی آبِ نشاط انگیز۔ یعنی قرآن کا دیا ہوا نظامِ ربوبیت!!

---

(۲)

وزیرِ اعظم صاحب کی نئی شادی نے ملک میں وحدت و تعددِ ازدواج کی جو حسین و سادہ و رنگین بحث چھیڑ رکھی ہے اس میں مولوی صاحبان اس بات کے ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ مرد چار بیویاں کرنے تک بالکل بے بہا ہے۔ اور اس کے اس حقِ شرعی پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا مداخلت فی الدین کے مرادف ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی طرف سے جو "دلائل" پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں بعض بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ مثلاً بیگمات کے احتجاج پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے ایک صاحب "تسنیم" میں شائع شدہ ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک اس تمام ہنگامے کے پیچھے عیاشی کا تصور کام کر رہا ہے۔ یہ عورتیں چاہتی ہیں کہ اپنے شوہروں کی دولت پر بلا شرکت غیرے تصرف کریں۔ اور ان کے عیش و عشرت میں کسی طرف سے کوئی مداخلت کرنے والا نہ ہو۔"

(تسنیم۔ لاہور۔ ۳۰ر اپریل)

ہمیں امید ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکین میں سے جن کے پاس ابھی تک صرف ایک ایک بیوی ہے وہ اپنی رفیقۂ حیات کو خدا اور رسول کے اس حکم کی تلقین ضرور کر رہے ہونگے۔ کہ اس طرح پورے گھر کی واحد مالک بن کر رہنا۔ اور کسی دوسری عورت کو اپنے "عیش و عشرت" میں شریک نہ ہونے دینا۔ خلافِ مسلکِ صالحیت ہے۔ اور اقامتِ دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خود جا کر کم از کم تین تین عورتیں اور تلاش کر کے لائیں۔ اور اس طرح خدا کے حضور ثابت کر دیں کہ ان کے دل "عیاشی" کے تصور سے یکسر خالی ہیں!

پناہ بخدا! جہالت انسان کو کہاں تک پہنچا دیتی ہے! اور پھر وہ جہالت جسے "رموزِ دین" سمجھ لیا جائے۔

مودودی صاحب کی رہائی!

اخبارات کو سرسری نظر سے پڑھنے والے بھی اس سوال کا جواب آسانی سے دے دیں گے کہ مولانا مودودی صاحب کی رہائی کیسے عمل میں آئی۔ اگر آپ اخبارات پڑھتے ہیں تو آپ کو اس کا جواب معلوم ہوگا یا آپ سمجھیں گے کہ آپ اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ زحمت نہ کیجئے۔ اس کا جواب خود جماعت اسلامی نے مہیا کر دیا ہے، سنئے۔

اخبار "تسنیم" لاہور لکھتا ہے۔ "یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ان حکمرانوں کی مرضی کے علی الرغم ایک دوسرا سبب ایسا پیدا کر دیا۔ جس کی بنا پر ان لوگوں کی ضمانت پر رہائی عمل میں آگئی ہے۔"

آپ پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ یہ "دوسرا سبب" جسے "اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان" بتایا جا رہا ہے کیا ہے۔ اس کی تفصیل بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

"پچھلے دو سال کے عرصہ میں مختلف حالات سے گذرتا ہوا آج پاکستان جس مقام پر کھڑا ہے۔ اس کی نزاکت کا ہر شخص کو احساس ہے۔ ایک طرف اس کے تمام مسائل حل طلب ہیں۔ اور دوسری طرف وہ نئی نئی پیچیدگیوں سے دوچار ہو چکا ہے۔ پاکستان کی یہ حالت ان لوگوں کی نظرِ عنایت کا نتیجہ ہے جن کے ہاتھ میں اس سارے عرصہ میں پاکستان کی باگ ڈور رہی ہے۔"

اب اس کے صغریٰ کبریٰ کو ملایئے۔ پاکستان کی حالت نازک ہے۔ اور وہ نئی نئی پیچیدگیوں سے دوچار ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کی وجہ سے ہے جن کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہے یہ پیچیدگیاں جو حکمرانوں کی نظرِ عنایت کا نتیجہ ہیں "اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان" ہیں۔ کیونکہ ان کی بنا پر مولانا مودودی صاحب کی رہائی عمل میں آئی۔ کچھ سمجھے آپ؟ نہ سمجھے ہوں تو اللہ سے غالب کے الفاظ میں اور "دل" مانگئے۔ ان حضرات کو تو اور "زبان" ملنے سے رہی۔

اقبال پر اپنی قسم کی پہلی کتاب
اقبال اور قرآن
قیمت دو روپے
(پرویز)

عالمِ اسلامی

عالم اسلامی پر سرسری سی نگاہ ڈالنے سے ہی یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اس میں بیک وقت دو متضاد عوامل کارفرما ہیں۔ ایک طرف تشتت و افتراق ہے دوسری طرف اتحاد و یگانگت، یہ دونوں عوامل قابل فہم ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ مسلمان ہونے کے اعتبار سے ممالک اسلامیہ میں گہرا قلبی رشتہ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس رشتہ اخوت کو عملی سیاست کا نقطہ ماسکہ نہیں بنایا جا سکا۔ اس کے برعکس جوں جوں مسلمان ممالک غیر کی غلامی سے آزاد ہوتے جاتے ہیں، وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے قریب ہونے کی بجائے باہم متصادم ہوتے جاتے ہیں، دوران کے بدخواہ اس رقابت سے فائدہ اٹھا کر ان کے اختلافات کو بڑی کوشش اور محنت سے ابھار ابھار کر انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

اتحاد کی کوششوں میں پیش پیش ترکی اور پاکستان و ایران کے مقابل میں مصر اور افغانستان ہیں۔ اول الذکر گروہ کا اثر بڑھتا جا رہا ہے اور اسے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب کہ وہ عالم اسلامی کو ایک رشتہ وحدت میں منسلک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بنڈونگ کانفرنس کو بتا دیا ہے کہ باوصف اختلافات ظاہری ترکی اور پاکستان اس کے دلی بہی خواہ ہیں۔ اور ہندوستان کے مقاصد اتنے دوستانہ نہیں ہیں، جتنے وہ زبان و قلم سے جتاتا ہے۔ چنانچہ ایک حد تک کہا جا رہا ہے کہ مصر کے خیالات میں تبدیلی آچکی ہے اور اس کا عملی نتیجہ زود یا بدیر نکلے گا۔ مصر اب تک زیادہ سے زیادہ شام اور سعودی عربیہ کو اپنے ساتھ ملا سکا ہے جہاں تک شام کا تعلق ہے جس معاہدہ کے لئے کوشش ہو رہی تھی، وہ ہنوز تکمیل تک نہیں پہنچا تھا کہ اس سلسلے پر شام میں صورت حال مخدوش ہو گئی۔ اب شام میں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک مصر سے تعاون کا متمنی ہے۔ اور دوسرا پاکستان اور ترکی کا ساتھ دینا چاہتا ہے شامی سیاست کا نقشہ بڑا عجیب ہے، وہ برسوں کے بعد کئی فوجی آمریتوں کا شکار رہتا ہوا گزشتہ سال بڑی مشکل سے انتخابات عامہ کرا سکا تھا لیکن اس کے ہاں سیاسی افراتفری مچی رہی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخابات سے بھی کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکی۔ اب ملک میں ایسے اختلافات ابھر آئے ہیں کہ پھر سے فوجی 'انقلاب' کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

انہی دنوں شام کے اسسٹنٹ آرمی چیف آف اسٹاف کرنل عدنان مالکی کو پراسرار طریق سے قتل کر دیا گیا۔ فوج مصر ہے کہ حکومت متعلقہ قوانین میں مناسب رد و بدل کر کے قتل کے مجرموں کو فوراً سزا دے۔ صدر عطاسی اس ترمیم کو خلاف آئین سمجھتے ہوئے اس کی منظوری کے حق میں نہیں۔ شام کے موجودہ قانون کی رو سے صورت یہ ہے کہ اگر اس کا صدر اس قانون کی منظوری دس دن کے اندر اندر نہ دے تو اس کے بعد یہ قانون از خود منظور شدہ تصور کیا جائے گا اگر صدر اسے مسترد کرنا چاہے تو از خود نہیں کر سکتا بلکہ اسے عدالت کے پاس بھیجے گا۔ یہ فیصلہ لینا ہوگا کہ وہ خلاف آئین ہے یہ قانون منظور ہو سکے گا یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے لیکن حکومت اور فوج کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی ہے۔ اور فوج کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ فوجی عنصر مصر کا مؤید ہے۔ وہ کامیاب ہو گیا تو ملک میں فوجی آمریت از سر نو قائم ہو جائے گی۔ لیکن استحکام کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو گی۔ یہ صورت حال مصر کے . . . نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسی حکومت مضبوط معاہدے کرنے اور ان پر عمل درآمد کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کے برعکس یہ فوجی عنصر کامیاب نہ ہو سکا تو ملک میں پاکستان اور ترکی کے معاہدے کے حق میں فضا سازگار تر ہو جائے گی۔ صورت کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ جب تک فوج عملی سیاست میں دخیل رہے گی ملک استحکام و توازن سے محروم رہے گا۔ لہذا ایک طرف یہ ضروری ہے کہ فوج سیاست سے علیحدہ رہے۔ اور دوسری طرف یہ کہ شام ہمسایہ ممالک سے معاہدے کر کے بیرونی خطرات کی طرف سے زیادہ سے زیادہ مصئون و مطمئن ہو جائے۔

مختلف اسلامی ممالک میں باہمی اتحاد کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا مرکز ان دنوں بہت حد تک پاکستان ہے۔ پاکستان میں سعودی عربیہ کے وزیر خارجہ اور سوڈان کے وزیر اعظم تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اول الذکر کا پاکستان آنا اس لحاظ سے اہم ہے کہ آئندہ حج کے موقعہ پر ممالک اسلامیہ کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کے انعقاد و اہتمام میں مصر، سعودی عربیہ اور پاکستان پیش پیش ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا آپس میں ملنا بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور انھیں قریب تر کر سکتا ہے۔

وزیر اعظم سوڈان کا پاکستان آنا کم خوش آئند نہیں، یہ نیا آزاد ملک ہے۔ گو اسے ابھی اپنے مستقبل کا آخری فیصلہ کرنا ہے لیکن اس کے آزاد ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نئی پیدا ہونے والی مملکت کے قائدین نئی ذمہ داریوں کا مناسب احساس رکھتے ہیں، چنانچہ وزیر اعظم سوڈان الازہری خصوصیت سے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پاکستان سے وہ کس قسم کی معاشی امداد لے سکتے ہیں، تاکہ وہ اپنے ملک کو معاشی ترقی کی راہ پر لے آئیں یہ افسوس کا مقام ہے کہ مصر کے قائدین کی باہمی رقابتوں نے سوڈان کو مصر سے الحاق کرنے سے بہت حد تک روک دیا ہے اور وہ مصر سے علیحدگی کی سوچ رہا ہے۔ اگر اس علیحدگی کے بعد اس کا مصر اور دیگر ممالک اسلامیہ سے تعاون رہے تو اس صورت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

افغانستان پاکستان کی دشمنی میں اندھا ہو گیا ہے۔ اور اس سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پاکستان کو جلال آباد اور قندھار میں اپنے قونصل خانے بند کرنے پڑے ہیں اور افغانستان کو کہنا پڑا ہے کہ وہ پشاور، کوئٹہ، چمن اور پاراچنار میں اپنے قونصل خانے اور تجارتی مراکز بند کر دے۔ افغانستان نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر بڑا خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ اس کے لندنی سفیر نجیب اللہ نے کہا ہے کہ اگر پاکستان اور افغانستان میں لڑائی ہوئی تو اس میں روس بھی شریک ہو جائیگا۔ اس کے سفیر متعینہ پاکستان نے کہا ہے کہ اگر پاکستان نے تجارتی مراعات واپس لے لیں۔ تو افغانستان روس کے ذریعہ دنیا سے تجارت کریگا۔ انھوں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ لیکن وہ اس کے ممکنات کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ روس کا دروازہ کھلا دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ جو اس دروازے میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نکل نہیں سکتا۔ گو افغانستان نے پاکستان کے خلاف بڑی اشتعال انگیزی سے کام لیا ہے۔ اور اس کا اسے پورا پورا جواب دینا چاہیئے۔ لیکن مسلم ممالک کو اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ کہیں اس بیوقوف مسلمان ملک کو روس نگل ہی نہ جائے۔ افغانستان اور پاکستان کے اس مناقشہ میں اس وقت تک جو حالات رونما ہوئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے۔ کہ اس باب میں افغانستان نے صریحاً زیادتی کی ہے اور وہ اس زیادتی پر اڑا ہوا ہے۔ اگر اس نے اپنی اس حماقت کو طول دیا اور مجبوراً نوبت لڑائی تک پہنچ گئی تو شکست اور فتح کسی کی ہو۔ نقصان تو بہرحال مسلمانوں ہی کا ہو گا۔ پاکستان کے مسلمانوں کا ہوا تو کیا۔ اور افغانستان کے مسلمانوں کا ہوا تو کیا۔ ان حالات میں دیگر اسلامی ممالک پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اس غلط رو بھائی کو سمجھائیں کہ وہ غیر کی باتوں میں آکر کس بھول میں پڑ گیا ہے اس باب میں ہمارے پاس قرآن کی راہنمائی بڑی واضح الفاظ میں ہے، جس کا ارشاد ہے کہ وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تمہیں چاہیئے کہ ان میں صلح کرا دو۔ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ پھر اگر ان میں ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرے اس کے خلاف تم جنگ کرو۔ تاآنکہ وہ خدا کے حکم کی طرف (کہ آپس میں صلح سے رہو) لوٹ آئے۔ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۴۹/۹) سو اگر زیادتی کرنے والا خدا کے حکم کی طرف آجائے تو پھر ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔ اور ان میں انصاف کرو، بے شک انصاف کرنے والوں کو خدا دوست رکھتا ہے۔

اسلام کا نظام معاشرت کیا ہے؟ اور وہ کیسے متشکل ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب

نظامِ ربوبیت

میں ملاحظہ کیجئے۔

بین الاقوامی جائزہ

مغربی جرمنی دس سال کے بعد آزاد ہوگیا ہے۔ اب وہ قدم قدم مسلح ہوگا اور ۱۲ ڈویژن فوج اقوام مغرب کے سپرد کرے گا۔ عالمی سیاست کا یہ اہم موڑ ہے۔ اور اس سے مشرق و مغرب کی کشمکش ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ روس نے ان معاہدات پیرس کو ناکام بنانے میں بڑا زور لگایا جن کی رو سے مغربی جرمنی آزاد ہوا ہے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے بالآخر غصے میں آکر برطانیہ اور فرانس سے وہ معاہدات منسوخ کر دیئے ہیں۔ جو جنگ کے دوران طے پائے تھے۔ اور جنہیں بیس سال تک نافذ العمل رہنا تھا۔

اس غصے کے باوجود روس نے اقوام مغرب سے مذاکرات کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس نے مغربی جرمنی کو ایک نیا چکر دیا ہے۔ پچھلے دنوں اس نے آسٹریا کے چانسلر کو ماسکو میں بلایا۔ اور معاہدہ امن کے لئے رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ ان دنوں ویانا میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے مقامی سفیروں اور آسٹریا کے نمائندوں کی کانفرنس معاہدہ کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف ہے۔ روس نے ماسکو میں آسٹریا سے یہ وعدہ لے لیا ہے کہ وہ معاہدہ امن کے بعد غیر جانبدار رہے گا۔ اس حد سے مطمئن ہو کر وہ بڑی مصالحت جوئی کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ دراصل جرمنی کے لئے ہی کیا جا رہا ہے۔ جرمنوں میں وحدت کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے۔ روس وحدت کا سراب دکھا کر مغربی جرمنی کو مسلح ہونے سے روکنا چاہتا ہے۔ چنانچہ کوئی عجب نہیں کہ آسٹریا کے چانسلر کی طرح وہ مغربی جرمنی کے چانسلر کو بھی ماسکو بلائے۔ مغربی جرمنی کے ڈاکٹر ایڈینار پوری طرح اقوام مغرب کے ساتھ ہیں۔ اور بظاہر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے لیکن وحدت کی امید میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

روس نے اگر ایک طرف مغربی جرمنی کے سامنے آسٹریا کی مثال پیش کی ہے۔ تو دوسری طرف اقوام مغرب کو بھی اپنی امن پسندی کا فریب دیا ہے۔ اس سے برطانیہ میں پھر سے یہ تحریک شروع ہوگئی ہے کہ دول اربعہ کی اعلیٰ ترین کانفرنس منعقد کی جائے۔ اب اس کے نقیب نئے وزیر اعظم سرانتھونی ایڈن ہیں۔ وہ اس پر ایک تو اس لئے زور دے رہے ہیں کہ اس تجویز کو چرچل نے پیش کیا تھا دوسرے اس لئے کہ اس ماہ کے آخر میں انگلستان میں انتخابات ہو رہے ہیں۔ نئے وزیر اعظم مخالفین کو خاموش کرنے کے لئے یہ حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ ایسی کانفرنس کے حق میں نہیں۔ وہ اس تک درجہ بدرجہ پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آسٹریا سے متعلق جو کانفرنس ہو رہی ہے وہ کامیاب ہو تو دول اربعہ کے وزرائے خارجہ آپس میں مل بیٹھیں۔ اور اس کے بعد ضرورت ہو تو رئیسان مملکت ملاقات کریں۔ چنانچہ ان اختلافات کو رفع کرنے کے لئے پیرس میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس شروع ہو گئی ہے۔

مغرب میں روس نے پرامن مساعی کی طرح ڈالی ہوئی ہے تو مشرق میں چین بھی ہاتھ روکے ہوئے ہے۔ وہ بنڈونگ کانفرنس میں اپنی امن پسندی کا اس قدر ڈھنڈورہ پیٹ چکا ہے کہ عام خیال یہی ہے کہ اس کے لئے جنگ شروع کرنا آسان نہیں ہوگا۔ لیکن ابھی تک فارموسا سے متعلق بات آگے نہیں بڑھی۔ البتہ ہندوستان کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی ہے کہ شاید فارموسا کا معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے بنڈونگ میں چو۔ این لائی نے اس تصفیہ کے متعلق وزیر اعظم پاکستان سے بات کی اور انھوں نے ہی چو این لائی کی تجویز کو امریکی حکومت کی طرف بھیجا۔ پاکستان کے علاوہ اور قوتوں نے بھی اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ گو پاکستان نے صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ وہ ثالث کا کردار ادا نہیں کرے گا۔ لیکن ہندوستان کو یہ فکر دامنگیر ہو رہی ہے کہ معاملہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے مشیر خاص کرشنا مینن چین جا رہے ہیں وہ چو این لائی سے مل کر پھر سے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ تاکہ کوئی اور ملک آگے نہ بڑھ جائے۔

ہند چینی میں پھر سے بدامنی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بدامنی جنوبی ویٹ نام یعنی غیر اشتراکی علاقے میں ہے۔ اس حصہ ملک کے بادشاہ باؤدائی ملک سے باہر ہیں۔ وہاں کے مذہبی فرقوں نے وزیر اعظم کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے۔ وہاں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کون کدھر ہے۔ وزیر اعظم نے شاہ کو معزول کرنے کے بعد ان سے وفاداری کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہاں صورت حال صبح و شام بدلتی ہے۔ اس کا ایک افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ اگر خانہ جنگی کی یہی صورت رہی تو آئندہ سال جب جنوبی اور شمالی ویٹ نام میں مشترکہ انتخابات ہوں گے تو اشتراکیت کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے فرانس اور امریکہ میں اختلافات نمودار ہو گئے ہیں۔ فرانس کی ہمدردی باغی مذہبی فرقوں کے ساتھ ہے۔ اور امریکہ کی جدید تربیت یافتہ وزیر اعظم کے ساتھ۔

اس سے سیٹو کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ بنڈونگ کے فوراً بعد آٹھ معاہد اقوام کے ۶۰ عسکری ماہرین نے باگیو (فلپائن) کے مقام پر ایک خفیہ کانفرنس کی۔ یہ کانفرنس ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کا کوئی اعلامیہ شائع نہیں ہوا ہے۔ باخبر حلقوں کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ناٹو کے طرز کی فوجی تنظیم کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک وجہ اختلاف یہ رہی کہ امریکہ اور برطانیہ کا خیال تھا کہ معاہدہ اقوام سے ان کے براہ راست جو فوجی معاہدے ہیں۔ اسی کے مطابق ان کو مدد دی جائے۔ اس کے برعکس پاکستان۔ فلپائن۔ تھائی لینڈ وغیرہ نے اصرار کیا کہ وہ دونوں انکی فوجوں کو سامان حرب بھی دیں۔ اور ان کی ہم تربیت بھی کریں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بالآخر فیصلہ کیا ہوا۔ لیکن اتنا یقین ہے کہ تعطل ختم ہو گیا ہے۔ اب ۷ جون کو فوجی مشیروں کی کانفرنس ہوگی۔ جس میں ان تجاویز کی تفاصیل طے ہونگی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناٹو کی طرح کی تنظیم پیش نظر ہے۔ اور اس کی تفاصیل طے ہو رہی ہیں۔

بزم طلوع اسلام

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھتی لیکن تاریخ انسانی پر نگاہ ڈالی جائے تو اتنے شواہد اس کی صداقت میں نہیں ملیں گے۔ جتنے اس کی تکذیب میں مل جائیں گے۔ آپ کو روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر یہی شواہد ملتے ہیں کہ ظالم ظلم کے باوجود بلکہ ظلم کی بناء پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ اور مظلوم ہیں کہ ان کی زندگی دن بدن دوبھر ہوتی جاتی ہے۔ تو کیا یہ کہنا غلط ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھتی اور دنیا کا چلن یہی ہے کہ ظالم ہی پھلتا پھولتا ہے؟

کئی لوگ اس کا جواب یہی دیں گے کہ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ اہل ظلم فروغ پاتے رہے ہیں۔ اور شاید ایسا ہی ہوتا چلا جائیگا۔ وہ بہت حد تک ٹھیک کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہی دیکھتے ہیں کہ ظلم کو برا کہنے اور سمجھنے کے باوجود ظلم کی روک تھام نہیں ہو سکی اور ظالم کامیاب ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ جب ان کے سامنے قرآن کا یہ دعویٰ پیش کیا جاتا ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ تو وہ اسے ایک اخلاقی وعظ سمجھ کر چنداں وقیع نہیں سمجھتے۔ وہ ایسا سمجھنے یا نہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ اقبال کے الفاظ میں "رشی کے فاقوں" سے "برہمن کا طلسم" نہیں ٹوٹا کرتا، مظلوموں کی آہوں، بد دعاؤں یا گالیوں سے ظلم کا استیصال نہیں ہوتا۔ ہم آج ظلم کو پھلتا پھولتا دیکھ رہے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اس کا علاج اخلاقی مواعظ سے کر رہے ہیں جو غلط ہے۔

قرآن نے جب کہا کہ ظالموں کی کھیتی ہری بھری نہیں ہو سکتی تو کہنے کو تو قرآن نے ایک پرانی بات دہرائی۔ لیکن دراصل اس نے ایک سربستہ راز کا انکشاف کیا۔ وہ راز یہ تھا کہ قرآن ایسا نظام معاشرت دے رہا ہے۔ جو اسے سچ کر کے دکھائے گا (مقصد قائما معکم کا یہی مفہوم ہے) کہ ظالم کی کھیتی جھلس کے رہ جائے گی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ظلم کا استیصال نظام کے بغیر ممکن نہیں۔ جب نظام عملی شکل میں قائم ہوتا ہے تو اخلاقی اصول حقائق ثابتہ بن کر محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیا معاشرہ کیسے قائم ہو؟ اس کیلئے قدم اول یہ ہے کہ آپ نئے معاشرے کو اپنے دل پر نقش کیجئے اور پھر جو کچھ آپ نے سمجھا ہے۔ دوسروں کو سمجھائیے۔ اس سمجھنے اور سمجھانے سے رفتہ رفتہ غلط معاشرے کے اندر ایک صحیح معاشرہ بنتا جائے گا۔ جوں جوں یہ جماعت بڑھتی جائے گی۔ اور آپس میں ربط باہمی پیدا ہوتا جائیگا جدید نظام کے اصول و مبادیات روزمرہ کی زندگی کو متاثر کرتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ یکون الدین کلہ للہ۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ

موجودہ معاشرہ فاسد ہے۔۔ اور اس کی بجائے صحیح معاشرہ وہ ہے۔ جس کی نشان دہی قرآن کرتا ہے۔ تو اس معاشرے کی داغ بیل کے لئے قدم اٹھایئے۔ خود بھی اس رنگ میں رنگے جایئے اور دوسروں کو بھی اسی رنگ میں رنگتے جایئے۔ آپ یہ کوشش شروع کیجئے۔ اور اسے جاری رکھئے۔ پھر دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے آپ ان کوششوں کو بزم طلوع اسلام کا نام دیجئے۔ اور ان ہم خیالوں سے تعلق پیدا کیجئے۔ جو اسی طرح مصروف جدوجہد ہیں۔ اس جماعت میں شامل ہو کر آپ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کریں گے۔ اور آپ کی مساعی بار آور ہوں گی کہ

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

گوجرانوالہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب داؤدی میزان العدل گھنٹہ بازار گوجرانوالہ بزم طلوع اسلام کی تشکیل کے لئے کوشاں ہیں۔ مقامی قارئین بدھ یعنی ۱۸ر مئی کو شام کے ۶ بجے ان کے ہاں جمع ہوں۔

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں:۔

سنہ ۴۹ء　اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
سنہ ۵۰ء　نومبر (ایک پرچہ)
سنہ ۵۱ء　مارچ تا نومبر
سنہ ۵۲ء　اگست تا نومبر
سنہ ۵۳ء　جنوری کے علاوہ سب
سنہ ۵۴ء　پورے سال کے

یہ پرچے بزم ہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں ورنہ پرچے ختم ہوجانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کراچی

اردو اسٹینوگرافر کی ضرورت

طلوع اسلام کے لئے ایک اچھے اردو اسٹینوگرافر کی ضرورت ہے۔ تنخواہ اور تقرری کا فیصلہ ٹیسٹ کے بعد ہوگا۔ ضرورتمند حضرات فی الفور ناظم ادارہ سے ملاقات کریں۔ بیرونی حضرات کو اپنے خرچ پر ٹیسٹ کے لئے کراچی آنا ہوگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

مطبوعات طلوعِ اسلام

معراج انسانیت ازپرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔
قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم ازپرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔
بڑی تقطیع کے ۳۰۷ صفحات　قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔
دو سو چوبیس صفحات　قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

سلیم کے نام ازپرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۵۰۴ صفحات　قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۳۰۸ صفحات　قیمت چار روپے

اسباب زوال امت ازپرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟
ایک سو اڑتالیس صفحات　قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۷۵ صفحات　قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں۔ اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۴ صفحات۔　قیمت چار روپے

مقام حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور　قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ ازپرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطہ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات　قیمت چھ روپے۔

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اسلامی معاشرت ازپرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲　قیمت دو روپے

نظام ربوبیت ازپرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت ساڑھے تین سو صفحے۔
قیمت۔ قسم اول　چھ روپے
　　　قسم دوم　چار روپے

اقبال اور قرآن ازپرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶۔　قیمت　دو روپے

نوٹ:۔ تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳۔ کراچی

نقد و نظر

اساس عربی

مولفہ محمد نعیم الرحمن ایم اے۔ ضخامت ۳۳۰ صفحات، غیر مجلد، قیمت پانچ روپے۔ شائع کردہ:- نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ فریئر روڈ کراچی

اس کتاب میں عربی صرف و نحو کے قواعد آسان اور سلیس انداز میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے عربی کی عام صرف و نحو سے ہٹ کر اس میں سائنٹفک طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب کی بنیاد مشہور مستشرق تھیچر کی عربی گرامر پر رکھی گئی ہے۔ لیکن صرف و نحو کی دوسری مروجہ کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ کتاب آج سے کوئی ۲۴ برس پہلے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ نے زیر نظر ایڈیشن دوبارہ چھاپا ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں (جو ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے) صرفی قواعد بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں نحوی قواعد ہیں جو ۳۲۳ صفحات پر ختم ہوتے ہیں۔ نحو کے سو عاملوں کو طلباء کی آسانی کے لئے اس طرح ایک نظم میں بیان کر دیا گیا ہے کہ سارے عوامل کے خواص اور ان کا طریق استعمال بآسانی کے ساتھ ان کی سمجھ میں آجائے گا۔ اگر طلباء یہ نظم جو صرف ایک صفحے کی ہے یاد کرلیں تو بہت سی نحوی غلطیوں سے بچ سکتے ہیں کتاب کے آخر میں چھ صفحات میں صرفی و نحوی اصطلاحات کے انگریزی مترادفات شامل کر دیئے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مصنف کا مختصر سا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے عربی زبان کی فضیلت بیان کی ہے۔ اور عام مسلمانوں کو اسے سیکھنے کی ترغیب دی ہے۔

یہ کتاب عام اردو داں طبقہ، عربی مدارس اسکولوں اور کالجوں میں عربی کا مضمون لینے والے طلباء کے لئے یکساں مفید ہے۔

مثنوی گلشن عشق

تصنیف ملا نصرتی۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ ضخامت ۲۲۳ صفحات غیر مجلد، قیمت ساڑھے چار روپے، شائع کردہ:- انجمن ترقی اردو (پاکستان) اردو روڈ۔ کراچی ۱

زیر نظر مثنوی عادل شاہیہ بیجاپور کے ملک الشعرا ملا نصرتی کی تصنیف ہے۔ جسے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے تصحیح و تحشیہ اور مقدمہ و فرہنگ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اردو کی قدیم اور نایاب کتابوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کی زبان دکنی اردو ہے۔ مگر اکثر قطب شاہی اور عادل شاہی شعراء کے مقابلہ میں نصرتی کی زبان زیادہ صاف ہے۔ اور معمولی سے غور و فکر کے بعد مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں تیس صفحے کا ایک فرہنگ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو گئی ہے۔ یہ مثنوی دلی دکنی سے بھی ساٹھ ستر برس قبل لکھی گئی تھی۔ یہ اس دور کا حال ہے جو بیت چکا۔ اور ان امتوں کی داستان ہے جو گذر گئیں۔ اب پیچھے مڑ کر ان کہانیوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا کارواں کن وادیوں اور راہوں سے ہو کر گذرا ہے۔ اپنے موجودہ مقام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کبھی کبھی گذرے ہوئے مقامات سے اس کا تقابل کر لیا جائے۔ ایسی کتابیں اس تقابل کا اچھا موقعہ مہیا کرتی ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک ان کی تاریخی حیثیت ہے۔ ورنہ ان کی حقیقی قیمت (INTRINSIC VALUE) نہ اپنے زمانہ میں کچھ تھی نہ اب ہے۔

سیر افلاک

مرزا محمد رشید ایم اے۔ سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج کیمبلپور۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ساڑھے تین روپے مجلد چار روپے۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ اردو روڈ کراچی۔

فلکیات بہت ہی تحیر انگیز لیکن اس کے ساتھ ہی دلچسپ موضوع ہے۔ اگر فلکیات کے مسائل بہت ہی سیدھے آسان انداز میں پیش کئے جائیں۔ تو بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب "افلاک کا مزہ آنے لگتا ہے"۔ اس موضوع پر انگریزی میں تو بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ مگر اردو میں اس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور جو کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ وہ نہ لکھنے کے برابر ہے۔ مرزا محمد رشید صاحب کی زیر نظر کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے کہ انھوں نے اس اہم موضوع پر نہایت سادہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اچھا خاصہ سامان فراہم کر دیا ہے۔ انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل اردو اصطلاحات بھی دیدی گئی ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے۔ یہ کتاب عام پڑھے لکھے لوگوں کے حلقہ میں عام طور سے اور طالب علموں کے حلقے میں خاص طور پر مقبول ہو سکتی ہے۔

طلوع اسلام کا دفتر

۲۳/۱ فاؤلرز لائن نیپیئر بیرکس میں واقع ہے۔ صدر کی طرف سے آنے والے حضرات نیپیئر بارکس میں داخل ہو کر بجائے سیدھے جناح اسپتال کی طرف جانے کے بائیں ہاتھ ڈرگ روڈ کی طرف مڑ جائیں تو تھوڑے فاصلہ پر بائیں ہاتھ کو پی ڈبلیو ڈی کے انکوائری آفس کے عقب میں طلوع اسلام کا دفتر ہے۔

اسی دفتر میں ہر اتوار کو صبح ۹ بجے محترم پرویز صاحب قرآن پر لیکچر دیتے ہیں۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے - ظاھر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا - اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے - یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی - اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی - اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے -

* پہلے ماھانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ھے - جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاھیں وہ دے سکتے ھیں -

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے - یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا -
- حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے - ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے -
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے - کتابوں کے لئے الگ -
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے - نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے -
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے -
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے - بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔ رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش۔ چھ روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے

دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔ جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں قسم اول از خود بھیجدی جائیگی۔ اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں یا قسم دوم لینا چاہیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی-۳۔

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ — شمارہ ۱۶ | کراچی : ہفتہ - ۲۱ - مئی ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ — سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

قران کی رو سے فرقہ بندی خدا کا عذاب ہے۔ایمان کے بعد کفر ہے۔ توحید نہیں بلکہ شرک ہے۔سوال یہ ہے کہ فرقے بنتے کس طرح سے ہیں؟ اس طرح کہ لوگ خدا کی دی ہوئی شریعت کے بجائے انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور چونکہ مختلف انسانوں کی شریعتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے ان کے پیروؤں میں اختلاف ہوتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے الگ الگ فرقے بن جاتے ہیں۔ قران میں ہے۔ ام لهم شركاؤا شرعوا لهم من الدين مالم ياذن به الله (۴۲/۲۱)۔ کیا ان کے کوئی شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کا ایسا راستہ (شریعت) مقرر کردیا ہے جس کی اجازت اللہ نہیں دیتا؟ اللہ اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ کوئی انسان کسی کے لئے دین کا راستہ مقرر کرے۔ دین صرف خدا کی طرف سے ملتا ہے اور اس کی سند خدا کی کتاب ہوتی ہے۔ قل ان هدى الله هو الهدى (۶/۷۱) ان سے کہدو کہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی ہی حقیقی اور سچی راہ نمائی ہے۔ اس کے سوا اور کسی کی راہ نمائی قبول کرنا شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

1. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر بات جو قرآن کے مطابق ہو صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
4. حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیتِ عالمینی یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی "نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

ابتداً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ دل ہے مسلمان میرا نہ تیرا ★ کراچی کا پانی ★ آزاد عراق ★ رہائش کا مسئلہ ★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت ★ عورت کا قران ★ مجلس اقبال ★ ابن جریر طبری ★ اندرون ہند
★ نقد و نظر ★ حقائق و عبر ★ باب المراسلات ★ بین الاقوامی جائزہ ★ عالم اسلامی

تازہ پیشکش

✡ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاھیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

ہفتہ وار
طلوع اسلام

جلد ۸ | ۱۴ر مئی سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر ۱۶

دل مسلماں ہے میرا نہ تیرا

سابقہ اشاعت میں ہم نے اس جگر خراش حقیقت پر تبصرہ کیا تھا کہ موجودہ خلفشار میں ابنائے پاکستان نے سیرت و کردار کے فقدان کا ایسا مظاہرہ کیا کہ مملکت کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا لیکن

درازی شب و بیداری من این ہمہ نیست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفت است

آج کی صحبت میں ہم ایسے ایک اور گوشے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ہم میں پاکستانی شعور کا کس قدر فقدان ہے اور جب اس فقدان کا یہ عالم ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے کیونکہ

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف!

زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ذرا تصور میں لایئے تقسیم سے پیشتر کے عشرے کو اور نگہ بازگشت ڈالئے اس نقشۂ سیاست پر جو طول و عرض ہند میں مسلمانوں کے موقف نے پیدا کر دیا تھا۔ آسام سے بلوچستان تک اور کشمیر سے مدراس تک کی ساری فضا ان نعروں سے معمور تھی کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ وہ علاقائی نسبتوں اور نسلی امتیازات سے اس قدر بالا ہیں کہ ایک مسلمان ہمسایہ ہندو سے مل کر نہیں بلکہ دور افتادہ ہم فکر و ہم خیال مسلمان سے مل کر ایک ملت واحدہ بنتا ہے۔ یک رنگی اور یک جہتی کا یہی جذبہ تھا جس نے تقسیم سے دو سال پیشتر ہندو اور انگریز دونوں کو یہ چیلنج دے دیا تھا کہ وہ انتخابات کے ذریعے آزما کے دیکھ لے کہ دس کروڑ مسلمان کس حد تک ایک ہی جماعت سے وابستہ ہیں اور ایک ہی مطالبہ پاکستان کے حامی اور مؤید۔ زمانہ شاہد ہے کہ سنہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلمانوں نے اس حقیقت کو بلا شائبہ ریب ثابت کر کے دکھا دیا۔ اسی غیر معمولی وحدت کا صدقہ تھا کہ اقبال کے خواب کی عملی تعبیر دو سال کی قلیل مدت میں متشکل ہو کر سامنے آ گئی۔

جہاں مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ پاکستان خلاف توقع حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔ وہاں انہیں نقصان بھی پہنچا کہ ان کے دو بڑے صوبے بنگال اور پنجاب بنام آبادی تقسیم ہو گئے گو اس تقسیم میں مسلمانوں سے سخت ناانصافی ہوئی اور کئی ملحق مسلم آبادی کے علاقے پاکستان سے کاٹ کر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے لیکن اس سے اس اصول پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ تقسیم ہند کی اساس ہندو مسلم آبادی تھی نہ کہ صوبے یا علاقے اگر تقسیم "غیر فرقہ وارانہ" بنا پر یعنی علاقائی یا صوبائی اعتبار سے عمل میں آتی تو بنگال اور پنجاب کبھی تقسیم نہ ہوتے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان نے صوبوں کو تقسیم کر تو دیا مگر بد بختی پاکستان صوبائیت پر قابو نہ پا سکی اور ملت اسلامیہ پاکستانیہ یوں دیکھتے دیکھتے صوبوں میں بٹ گئی جیسے وحدت و اخوت ایک منافقانہ پردہ تھا جو ذرا سی کشاکش سے چاک ہو گیا۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک دین، ایک ملک کے نعرے لگانے والے تشتت و افتراق کی دلدل میں یوں دھنسے اور دھنستے چلے گئے کہ بنگالی سندھی، پٹھان، وغیرہ اپنے آپ کو جداگانہ قومیں تصور کرنے لگ گئے۔ اس سے بین الصوبائی رقابتوں کا گھناؤنا دور شروع ہوا۔ صوبے پاکستان پر مقدم ہو گئے اور پاکستانی شعور عنقا ہو گیا۔ پاکستان کی سات سال کی سیاست اسی کشمکش کردہ کی شرمناک داستان ہے۔ رسوائے دہر مجلس دستور ساز کا المیہ کی یہ روداد تھی۔ یہ اسی کی کارگذاری تھی کہ مشرقی پاکستان نے آزادی اور علیحدگی کے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے تھے اور جب ملک کے لئے زبان کا مسئلہ سامنے آیا تو اس نے پاکستان کو مینار بابل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مجلس مذکورہ پاکستان کو مکمل تباہی کے غار تک لے آئی تھی کہ روح پاکستان ابھری اور یہ طلسم سامری ۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء کو محترم غلام محمد کی ضرب کلیمی سے ٹوٹ گیا۔ گورنر جنرل کے جرأت مندانہ اقدام کے بعد یہ کہا جا سکتا تھا کہ

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

اور یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ اب ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنے والا کوئی نہیں اٹھے گا۔ چنانچہ ملک میں وحدت کا پھر سے چرچا ہونے لگا۔ اور وہی ارباب سیاست جو پہلے ذاتی منافع اور صوبائی تفوق کے لئے کوشاں تھے کشادہ نگہی اور پاکستانی شعور کے مظہر بن گئے۔ اس فضا میں جو کام سات سال تک سر انجام نہیں پا سکے تھے وہ دنوں میں تکمیل کے مراحل طے کرتے نظر آئے۔ مغربی صوبوں کے خاتمے کی تفاصیل چند مہینوں میں طے پا گئیں اور آئین پاکستان کا مسودہ بھی حکومت کے ماہرین نے قلیل ہی مدت میں طے کر لیا

لیکن جب عدالتی چارہ جوئیوں سے قدرے فراغت پا کر گورنر جنرل نے آئین ساز کنونیشن کے انعقاد کا اعلان کیا اور اس کے لئے طریقہ انتخاب شائع کیا تو وہی ڈوبے ہوئے منحوس تارے ایک ایک کر کے ابھر آئے۔ وحدت کے گیت گانے والے افتراق و صوبائیت کے بے سرے الاپنے بیٹھے اور پھر ایسا نظر آنے لگا کہ وحدت کا جو سماں نظر آ رہا تھا وہ ایک فریب تھا۔ اس پردے میں نفاق ونفرت کے وہی دیو ناچ رہے تھے جن سے ۲۴ر اکتوبر کو بظاہر گلو خلاصی کرا لی گئی تھی۔ مشرق و مغرب میں کہیں پاکستان کا نام سنائی نہیں دیتا تھا۔ ہر طرف صوبے ہی صوبے تھے۔ اب ذرا سوچئے کہ کنونیشن کے اعلان سے ملک میں کیا صورت حال پیدا ہوئی تھی؟ واضح رہے کہ یہاں سوال کنونیشن کے قانونی جواز و عدم جواز کا نہیں۔ ہم اس سے قطع نظر کر کے محض ایک اصول کی تشریح و تبیین کر رہے ہیں۔ کنونیشن کا کام تسوید آئین تھا۔ لہٰذا اس کے لئے یہ خیال رکھا جانا چاہیئے تھا کہ ایسے امیدوار منتخب کئے جائیں جو دستور و آئین کو سمجھتے ہوں، نیز انہیں اس کا شعور ہو کہ بحالات موجودہ ملک کو کس قسم کے آئین کی ضرورت ہے۔ گویا معیار انتخاب اہلیت ہونا چاہیئے تھا۔ اور جب اہلیت کا سوال سامنے آتا ہے تو پھر یہ سوال غیر وقیع ہو جاتا ہے کہ کوئی اہل شخص ملک کے کس گوشے میں پیدا ہوا۔ یا اس کی اضافی نسبت کیا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب برطرف شدہ مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں لایا گیا تھا تو اس وقت جس شخص کو مناسب سمجھا گیا تھا منتخب کر لیا گیا تھا بغیر یہ سوچے کہ وہ کس صوبے یا کس علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں جب یہ مرحلہ پھر سے پیش آیا تو وحدت کے زبانی جمع خرچ کے باوجود صوبائیت کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ الامان والحفیظ!

مشرقی پاکستان سے چلئے، وہاں عوامی لیگ نے کنونیشن میں شمولیت کا فیصلہ کیا لیکن شرط یہ لگائی کہ اس میں عوامی لیگ کے ارکان بھیجے جائیں۔ شاید اپنی جماعت تک محدود رہنا آج کی سیاست میں قابل فہم ہو۔ ہمارے نزدیک یہ قابل معافی نہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس جماعت نے اتنی عالی ظرفی کا بھی ثبوت نہیں دیا کہ صوبائی جماعت کے دائرہ سے باہر نکل کر کسی دوسرے صوبے سے عوامی لیگ کے ایک رکن کو ہی منتخب کر لیتی۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کا کوئی ایک بھی ایسا قابل رکن موجود نہیں جسے مشرقی پاکستان والے بر بنائے اہلیت منتخب کریں؟ لیکن یہاں سوال اہلیت کا نہیں صوبائیت کا ہے

اور امیدوار وہ صحیح ہے جو اپنے صوبے سے تعلق رکھتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے بعد سندھ کو لیجئے۔ وزیر اعلیٰ مسٹر کھوڑو نے ایک طرف یہ اعلان کیا کہ ان کی جماعت کی تجویز یہ تھی کہ اگر پنجاب کے گورمانی صاحب چاہیں تو انہیں سندھ سے منتخب کر لیا جائے۔ قطع نظر تخیلات کے اس تجویز سے وحدت کی بو آتی تھی۔ لیکن یہی جماعت مسٹر گورمانی کے انکار کے بعد صوبائیت میں ڈوب کر اپنے لیڈر پر یہ پابندی لگا دیتی ہے کہ وہ کسی غیر سندھی کو امیدوار نامزد نہ کریں۔ بعینہٖ یہی مظاہرہ سرحد میں ہوتا ہے وہاں بھی لیڈر کو یہی "اختیار" دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے صوبے ہی کے افراد منتخب کریں۔ ذہنیت کس حد تک مسموم ہو چکی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس بیان کو سامنے لائیے جو عبدالقیوم خاں نے دیا۔ خان صاحب مسلم لیگی ہیں وہ صوبے میں وزیر اعلیٰ اور مرکز میں وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ سابقہ مجلس دستور ساز کے رکن بھی تھے اور سرحدی ہونے کے باوجود بنگال سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ "باہر کے" آدمی منتخب نہ ہوں۔ گویا غیر سرحدی سب "باہر" کے ہیں۔ معلوم نہیں یہ راز خان صاحب پر کب کھلا؟ انہیں اس اصول کا ایسا ہی پاس تھا تو انہوں نے بنگال سے منتخب ہونا کیوں گوارا کر لیا؟ کیا بنگال کے لئے وہ "باہر" کے نہیں تھے؟

صوبائیت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پنجاب سے روشنی کی ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ وہاں سے جو نعرہ بلند ہوا وہ صوبائیت کے کوہساروں کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ لیکن ابھی اس کی گونج بھی ختم نہیں ہو پائی تھی کہ پنجاب کے ارباب سیاست باہم دست و گریباں ہو گئے۔ آپس میں مل کر متفقہ طور پر مرکز کو حق نامزدگی دے کر اور ضبط و اعتماد کی ایک نئی دنیا بسا کر یہ سیاسی پہلوان اکھاڑے میں اتر آئے۔ یہ مقام صوبائیت سے بھی پست تر ہے۔ یہ کچھ دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ

باوصف ادعائے ظاہری

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے صوبائیت کا یہ مظاہرہ اُس کنونشن کے سلسلہ میں روا رکھا گیا جس کا مقصد پاکستان کے لئے آئین بنانا تھا۔ ہر چند یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں کہ آئین سازی میں جو تاخیر ہوئی ہے اور اس میں جو جو پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں وہ سب تخم خبیث صوبائیت کے تلخ ثمرات ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ سات سال تک ان کڑوے پھلوں سے کام و دہن کا حلیہ بگاڑنے کے باوجود ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی۔ گلو خلاصی کی کوشش تو ایک طرف رہی، الٹا انہی کو جان بخش و حیات آور سمجھا جا رہا ہے یوں تو ہمارے نزدیک کوئی ایسا مفاد نہیں جسے صوبائی قرار دے کر عمومی پاکستانی مفاد پر اسے مقدم سمجھا جائے۔ کیونکہ ملکی مفاد میں سب کا مفاد ہوتا ہے، لیکن اگر صوبائی مفاد کے لئے کوئی وجہ جواز ہو سکتی تھی تو اس کے لئے مناسب میدان مغربی پاکستان کی انتظامی کونسل تھی نہ کہ آئین ساز کنونشن (اور جہاں تک انتظامی کونسل کا تعلق ہے اس میں خوب دل کھول کر صوبائیت کے کھل کھیلے گئے ہیں مغربی وحدت کے تانے بانے میں صوبائیت کے جن تاروں کی آمیزش پائی جاتی ہے اس پر تفصیلی تبصرہ طلوع اسلام میں آچکا ہے)

یہ تو کنونشن کے بارے میں ہوا۔ اب کنونشن کی بجائے مجلس دستور ساز منعقد ہوگی، اس نام کی تبدیلی سے اس ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جس کا ماتم سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ قدرت نے ہمیں ایک اور موقع عطا کر دیا ہے اور پھر سے مہلت دیدی ہے کہ ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں اور اس فساد فکر و نظر سے بچیں جس نے ہمیں تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا تھا اس لئے ہم ارباب سیاست سے بصمیم قلب یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ صوبائیت کی "تنگ نظری" سے بچیں اور ملک کو یقینی تباہی سے بچائیں۔ اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم صوبائیت کے بجائے "پاکستانیت" کو اپنا شعار بنائیں۔ اگر ہم میں پاکستانی شعور اب بھی نہ ابھرا اور ہم اپنے آپ کو بدستور پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی ہی سمجھتے رہے تو وہ درخشندہ مستقبل جس کی تشکیل کی طرف قیام پاکستان قدم اول تھا ایک بھیانک منزل میں تبدیل ہو جائے گا۔ پھر ہماری تباہی مقدر ہو جائے گی اور

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

رہائش کا مسئلہ

زمانے کے حالات اب اس حد تک بدل چکے ہیں کہ معاشرہ انسانی کے وہ مسائل جو کچھ عرصہ پیشتر انفرادی طور پر نپٹالئے جایا کرتے تھے۔ آج وہ افراد کی بساط سے ایسے باہر ہو چکے ہیں کہ ان کے حل کے لئے اجتماعی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس راز کو سمجھ لیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں ایسے امور یا تو حکومت کی تحویل میں چلے گئے ہیں۔ یا ایسے نجی اداروں کے تصرف میں جو ہیئت اور ذرائع کے اعتبار سے بجائے خود چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں وسعت پذیر معاشری مسائل کا حل چنداں دشوار نہیں رہا۔ اس کے برعکس پسماندہ اور غریب ممالک میں کہ ان کے ہاں اجتماعی شعور کا بالعموم فقدان ہے۔ ان معاملات سے انفرادی طور پر ہی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ بیشتر مسائل الجھتے جا رہے ہیں اور گوناگوں پریشانیوں کا موجب بنتے جا رہے ہیں۔

مثال کے طور پر رہائشی مکانات کے سوال کو لیجئے یادداشت پر ذرا بوجھ ڈالئے۔ آپ دیکھئے گا کہ یہ ایک آسان سا مسئلہ ہوا کرتا تھا۔ مکانات بالعموم یا تو موروثی ہوا کرتے تھے یا اپنے طور پر حسب ضرورت اور استطاعت تعمیر کرا لئے جایا کرتے تھے۔ یا کرائے پر لے لئے جایا کرتے تھے۔ لیکن گزشتہ جنگ اور تقسیم ہند نے اس سوال کو ایسا الجھا دیا کہ آج تک اس کا خاطر خواہ حل نہیں مل سکا۔ ہمارے ہاں مکانوں کی قلت کی دو وجوہ ہیں۔ ایک مفلوک الحال مہاجرین کی آمد ہے مہاجرین پاکستان میں یکلخت سیل بے پناہ کی طرح آ ہی نہیں گئے بلکہ ان کا تسلسل تا حال بندھا ہوا ہے۔ اور وہ ہر روز پاکستان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مہاجرین کھلے آسمان کے نیچے جا بجا پڑے ہوئے ہیں اور دوسری وجہ نئے نئے کارخانوں کا قیام ہے۔ ان میں ہزاروں کارکن کام کرتے ہیں اور سینکڑوں ملازمت کی امید میں گرد و نواح میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کے لئے رہائش کا کوئی انتظام نہیں۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ اس ہمہ گیر مسئلہ کو اجتماعی طور پر حل کیا جاتا۔ یعنی ایک طرف حکومت اپنے ملازمین اور مہاجرین کے لئے وسیع پیمانہ پر مکانات تعمیر کرتی اور دوسری طرف بڑے بڑے کارخانہ دار اپنے کارکنوں کے لئے رہائش کا انتظام کرتے۔ لیکن بلند بانگ دعووں کے باوجود اس ضمن میں جو کچھ کیا گیا وہ اصلی ضرورت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ حکومت نے انفرادی طور پر جو مساعیاں مہیا کیں وہ بجائے خود مستحسن تھیں لیکن چونکہ انجام کار ذمہ داری افراد کی تھی، اس لئے خاطر خواہ ترقی نہیں ہو سکی۔ کراچی میں دیکھئے گو غیر معمولی دباؤ سے مکانات جگہ بہ جگہ بن گئے لیکن رہائش کا مسئلہ بدستور دردسر بنا ہوا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ رفتار کار ضرورت کے مطابق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکان بنانے والوں میں زیادہ تر کم استطاعت والے ہیں۔ اور وہ انفرادی طور پر اس پر قادر نہیں کہ کم از کم وقت میں ایسے مکانات کھڑے کر دیں جو ان کی اور دوسروں کی ضرورت پوری کریں اس کا نتیجہ ہے کہ کئی مکان تکمیل نہیں پا سکے۔ اور بہت سے ادھورے پڑے ہیں۔

ان حالات میں اگر حکومت یا بڑے بڑے تعمیری ادارے اس معاملے کو ہاتھ میں لے لیتے تو آج اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو ہمیں کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر اب بھی اس تجربے سے سبق حاصل کر لیا جائے تو اس پریشانی سے بچنے کی صورت ہو سکتی ہے۔ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی وزارت تعمیرات کراچی کے لئے ایک "تعمیری ادارہ" مقرر کرنے پر غور کر رہی ہے۔ یہ ادارہ مکان بنانے والی بڑی منتخب کمپنیوں کی مدد سے وسیع پیمانے پر مکانات تعمیر کرے گا اور انہیں آسان قسطوں پر ضرورت مندوں کو دے دیگا۔ کہا جاتا ہے کہ تین قسم کے مکان زیر تجویز ہیں۔ ایک کی قیمت پانچ ہزار روپے ہوگی۔ دوسرے کی آٹھ ہزار، اور تیسرے کی بارہ ہزار۔ مکان حاصل کرنے والوں کو شروع میں مکان کی لاگت کا بیس فی صدی حصہ ادا کرنا پڑے گا۔ اور بقایا رقم آسان قسطوں میں بے باق کرنا ہوگی۔ یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ جو حضرات یہ ادائیگی بآسانی نہیں کر سکیں گے ان کے لئے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن، انشورنس کمپنیوں، بنکوں وغیرہ کے ذریعے پیسے کا انتظام کرا دیا جائے گا۔

یہ تجویز ابھی حکومت کے زیر غور ہے اور اس کی پوری تفاصیل بھی منظر عام پر نہیں آئیں۔ اس لئے ہم اس کے مالہٗ و ماعلیہ پر تفصیلی تبصرہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اصولی نقطۂ نظر سے ہم اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں اور حکومت سے التماس کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اسے منظور کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دے کیونکہ مکانوں کے ضرورتمند برسوں سے پریشان ہو رہے ہیں

اور بظاہر ان کی پریشانیوں کے خاتمے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

ہم اس بارے میں چند باتیں حکومت کے گوش گذار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اول۔ مجوزہ ادارہ کو تجارتی خطوط پر نہیں چلانا چاہیئے۔ یہ تجربہ بہت حد تک ناکام ہو چکا ہے۔ مثلاً ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے مکان بنانے والے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس ادارے نے سود و زیاں کے تجارتی اصولوں کو مد نظر رکھا۔ اب چونکہ حکومت اس کام کو ہاتھ میں لے رہی ہے اس لئے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ یہ منافع بخش کاروبار نہ بن جائے چونکہ تعمیر کا کام وسیع پیمانے پر ہوگا اس لئے اخراجات خود بخود مقابلتہً کم ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سے کتنے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں نہ یہ کہ اس سے کس قدر منافع حاصل ہوتا ہے۔ دوئم مکانوں کو ایک طے شدہ نقشے کے مطابق بنانے سے کہیں بہتر ہوگا کہ رہنے والوں کی رائے اور ضرورت کے مطابق اس میں رد و بدل کر دیا جائے اس میں گنجائش بھی رکھی جا سکتی ہے کہ اگر اس طرح اخراجات تھوڑے سے بہت بڑھ جائیں تو یہ وصول کر لئے جائیں گے۔ سوئم۔ اس تجویز کا فائدہ ان ضرورت مندوں کو بھی ملنا چاہیئے جن کے پاس اپنی زمینیں تو ہیں لیکن وہ گوناگوں دشواریوں کی بدولت مکانات تعمیر نہیں کرا سکے۔ ان سے مقررہ رقم کی بجائے اصل لاگت وصول کی جائے۔ چہارم اس وقت خیال یہ ہے کہ اگر کراچی میں یہ تجربہ کامیاب ہوا تو مجوزہ ادارے کو پاکستان بھر میں پھیلا دیا جائے گا۔ تجربے سے فائدہ اٹھانا بجا لیکن حکومت کو یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں سابقہ حکمت عملی جس کی رو سے افراد اپنے اپنے مکانوں کی تعمیر کے خود ذمہ دار تھے ناکام ہو چکی ہے۔ اور اب کامیابی کی یہی صورت ہے کہ تعمیر مکانات کا کام اجتماعی طریق سے سر انجام دیا جائے۔ جب یہ اصول درست ہے تو تجربے سے اس کی تفصیلات میں اصلاح و ترمیم کی جا سکتی ہے، لہٰذا اس تجربے کو کراچی تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس وقت اشد ضرورت ہے کہ لاہور پر توجہ دی جائے۔ ایک صوبے کے قیام سے لاہور میں رہائش کا مسئلہ جو پہلے ہی پریشان کن تھا، غیر معمولی طور پر پریشان کن ہو گیا ہے۔ اسے کم سے کم وقت میں حل کرنا چاہیئے۔ لہٰذا کراچی کی طرح لاہور میں بھی فی الفور ایسا ادارہ قائم کر دیا جائے۔ پنجم۔ تعمیر مکانات کا کام حکومت کے علاوہ بڑے بڑے کارخانہ دار بھی کر سکتے ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ انہیں مجبور کرے کہ وہ اپنے عملہ کے لئے مناسب مکانات تعمیر کرے۔ اس میں حکومت کا بوجھ ہلکا ہوگا، عملہ کو آسانی ہوگی اور کارخانے داروں کا بھلا ہوگا۔

کراچی کا پانی

وزارت تعمیرات کے جوائنٹ سکریٹری، مسٹر اسحاق نے پچھلے دنوں کراچی کے پانی سے متعلق جو بیان دیا وہ حد درجہ افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔ افسوس یا تکلیف کی بات یہ نہیں کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ کیوں کہا، بلکہ یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے آج کہا وہ آج سے بہت پہلے کیوں نہ کہہ دیا گیا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ کراچی کی آبادی تقسیم کے وقت ساڑھے تین لاکھ تھی اور اب پندرہ لاکھ ہو چکی ہے۔ اور یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے مطلوبہ مقدار میں صاف ستھرا پینے کے قابل پانی مہیا کرنا آسان نہیں۔ اس کا احساس بھی اکثر لوگوں کو ہے کہ کراچی کے اپنے ذرائع آب رسانی نہ ہونے کے برابر ہیں اور شہر میں پانی دور سے اس طریق سے لانا پڑتا ہے کہ اس کے لئے بڑی محنت، سرمایہ اور فنی تجربہ درکار ہے اور ہمارے ہاں ان کا فقدان ہے یہ مشکلات راہ اپنی جگہ درست، لیکن اس کا کیا جواب کہ متعلقہ ارباب حکومت ارباب شہر کو برسوں یہ سراب دکھاتے رہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ کراچی حل تعمل ہو جائے گا اور پھر کوئی شہری قطرۂ آب کے لئے پریشان و بے آبرو نہیں ہوگا۔ جب بھی کسی حکومتی نمائندے نے بات کی ہے اس نے یہی کہا ہے کہ مطلوبہ کام اب ہوا جاتا ہے، اب ہوا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بڑی بڑی سکیمیں تیار ہوئیں، ان کے ڈھنڈورے پیٹے گئے اور ہمارے انجنیر یورپ اور امریکہ کی یاترا کرتے رہے۔ ہر بار ہمیں یہی بتایا جاتا رہا کہ اس منصوبہ کو تیار ہونے دیجیئے، ان صاحب کو ذرا یورپ کے فلاں شہر کے طریق آب رسانی کا مطالعہ کرنے دیجیئے پھر دیکھیئے کیسے پانی کی دائمی نہریں بہنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں یورپ کے جتنے چکر لگائے گئے ان کا سفر خرچ جمع کیا جائے تو ان اخراجات کا معتدبہ حصہ بن جائے گا جو اچھے منصوبہ آب کے لئے درکار ہو سکتے ہیں۔

اب ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک سات کروڑ روپے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے جو ۱۹۵۷ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گا اور ۱۹۵۸ء کے دوران میں رواں ہو جائیگا۔ یہ ہو گیا تو روزانہ ۷۰ کروڑ گیلن یعنی فی کس ۵۰ گیلن پانی مہیا کیا جا سکے گا۔ اس وقت تک گویا تین سال کے لئے کراچی کو موجودہ مقدار آب پر گزارہ کرنا ہوگا۔ یہ کچھ امر واقعے کے طور پر کہا جاتا تو اہل شہر کو اس سے دکھ نہ ہوتا لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب تک جھوٹے وعدوں کا فریب دیا جاتا رہا۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اس قدر غلط وعدہ کرنے کی آخر کیا وجہ جواز ہے؟ اسحاق صاحب نے اپنے بیان میں خاصی صاف گوئی سے کام لیا ہے، اور ہمیں اس کی خوشی ہے کہ انہوں نے صاف بات کرنا مناسب سمجھی لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ ۱۹۵۸ء میں وہ یا ان کے جانشین ہمیں یہ نہیں سنا دیں گے کہ اب کراچی فلاں بن گیا ہے، لہٰذا پانی کی مطلوبہ مقدار کے لئے مزید تین سال انتظار کرنا ہوگا۔ ارباب حکومت نے گزشتہ آٹھ سال میں کم از کم یہ تو دیکھ لیا ہوگا کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے، الفاظ کام کا بدل نہیں ہو سکتے اور کام کرنے ہی سے ہوتا ہے۔ اگر اسحاق صاحب اپنے وعدوں میں ایسے ہی سچے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ جو منصوبہ زیر تعمیر ہے، اس کی رفتار ترقی سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اہل شہر کو باخبر کرتے رہیں، اور اگر انہیں اس کی تکمیل میں کوئی دشواری پیش آئے تو بعد از وقت عذر تراشی کے طور پر اسے پیش کرنے کی بجائے اس کی بابت بر وقت اطلاع دے دیں تاکہ پبلک کو صحیح حالات سے آگاہی حاصل رہے اور وہ کام کا اور کام کرنے والوں کا محاسبہ کرتی رہے۔

اسحاق صاحب نے بجا طور پر اہل شہر سے اپیل کی ہے کہ وہ پانی کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لیں۔ یہ اپیل ایسی ہے کہ جس پر ہر شہری کو عمل کرنا چاہیئے کیونکہ جو بھی پانی بچے گا ان علاقوں میں تقسیم ہو سکے گا جہاں پانی کی کمی ہے۔ لیکن حکومت کو جاننا چاہیئے کہ خالی اپیلوں سے کچھ کام نہیں بنتا اس کے لئے ضروری ہے کہ پوری طرح ملک کا تعاون اور ہمدردی حاصل کی جائے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اہل شہر کو یہ اعتماد نہ ہو کہ ارباب آب پوری محنت سے کام کر رہے ہیں، لہٰذا وہ ہر طرح کی ہمدردی اور تعاون کے مستحق ہیں۔

ایسے اعتماد کی جو گنجائش ہو سکتی ہے وہ کراچی کارپوریشن کے چیف افسر نے ختم کر دی ہے۔ جس پریس کانفرنس میں اسحاق صاحب نے زیر نظر بیان دیا اس میں آپ بھی موجود تھے۔ آپ نے یہ بتایا کہ کیسے بلدیہ گدھے گاڑیوں اور ٹرکوں کے ذریعے ان علاقوں تک پانی پہنچاتی ہے جہاں پانی کم ہے یا بالکل نہیں۔ ان کا انداز بیان ایسا تھا گویا بلدیہ ایسا کر کے ان علاقوں کے محروم آب انسانوں پر احسان کرتی ہے۔ انہیں اور ان کے رفقائے بلدیہ کو اچھی طرح یہ جان لینا چاہیئے کہ اگر وہ اس قسم کا کوئی انتظام کرتے ہیں تو یہ ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے اور انہیں ایسا کرنا ہی چاہیئے۔ وہ اس فریضہ کی بجا آوری میں کوتاہی کریں گے یا اسے بطریق احسن سر انجام نہیں دیں گے تو اسے انکی نااہلی پر محمول کیا جائے گا۔ ضمناً چیف افسر صاحب نے یہ شکایت کی کہ بھشتی ان سے سستا پانی لے کر مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ یہ واقعی ایک گھناؤنا فعل ہے اور اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ لیکن یہ نتیجہ ہے خود بلدیہ کی نااہلی کا۔ اگر بلدیہ اپنے فریضۂ منصبی کو پورا کرنے کی امکانی کوشش کرے اور زیادہ سے زیادہ پانی مہیا کرے تو یہ بلیک مارکیٹ کی لعنت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ہم چیف افسر صاحب سے التماس کریں گے کہ وہ خدمت شہر کو اپنا اور بلدیہ کا شعار بنائیں اور خدمت کے زور پر اہل شہر کا تعاون اور ہمدردی حاصل کریں۔ اگر وہ اس طرح شہر کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی اور اہل شہر کی وہ شکایتیں جو باہمی بداعتمادی سے پیدا ہوتی ہیں بالکل ختم ہو جائیں گی

ہماری ان گزارشات کا براہ راست روئے سخن تو منتظمین کراچی کی طرف ہے۔ لیکن در حقیقت ان کے مخاطب تمام مملکت پاکستان کے ارباب حل وعقد ہیں خواہ کسی صوبہ اور کسی شہر سے متعلق ہوں۔

آزاد عراق

عراق یوں تو ۱۹۳۲ء میں برطانوی انتداب کے خاتمہ پر آزاد ہو گیا تھا لیکن اس کے دور محکومی کی زنجیر کا ایک حلقہ ابھی تک ایسا باقی تھا جو اس کی مکمل آزادی کے لئے پا بہ زنجیر بن رہا تھا۔ برطانیہ اور عراق نے ۱۹۳۰ء میں ایک معاہدہ کیا تھا جو انتداب ختم ہونے پر ۱۹۳۲ء میں نافذ العمل ہوا۔ اس کی رو سے عراق کے دو ہوائی اڈے، حبانیہ اور شعیبہ برطانیہ کی تحویل میں آگئے تھے۔ آجکل کی سیاست میں کسی ملک کے فوجی اڈوں کا کسی دوسرے (حلیف) ملک کے لئے کھلا رہنا محکومی یا زیر دستی کی دلیل نہیں سمجھا جاتا۔ خود برطانیہ کے فوجی اڈے امریکہ کے پاس ہیں اور اس سے برطانیہ کی آزادی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن جو ملک پہلے کسی ملک کا محکوم رہ چکا ہو اس کے فوجی اڈوں پر اس کے سابقہ حاکم ملک کا عمل دخل، ایک "نفسیاتی" اثر ضرور رکھتا ہے۔ جس سے وہ آزاد شدہ ملک غیر شعوری طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ ابھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ اس اعتبار سے عراق کی دلی خواہش تھی کہ وہ عہد غلامی کی اس یادگار کو جلد از جلد مٹا سکے لیکن اس کے لئے اس نے شور اور واویلا مچانے کی بجائے کوشش یہ کی کہ اسے بین الاقوامی سیاست میں ایسا موثر مقام حاصل ہو جائے جس کے پیش نظر برطانیہ از خود اس حلقۂ زنجیر کو توڑ کر الگ کر دے۔ یہ مقام اسے اس وقت حاصل ہوا جب اس نے ترکی سے معاہدۂ دفاع کیا اور اس میں یہ گنجائش رکھی کہ وہ مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کی اساس بن سکے۔ اس معاہدہ میں برطانیہ کی شرکت نے ۱۹۳۰ء کے برطانوی عراقی معاہدے کو کالعدم بنا دیا، کیونکہ نئی صورت حال اس کی بجائے نئے دفاعی انتظام کی متقاضی تھی۔ چنانچہ اس ماہ کے شروع میں برطانیہ نے حبانیہ کا اڈہ خالی کر کے عراق کے حوالے کر دیا ہے۔ شعیبہ کا اڈہ عنقریب خالی کر دیا جائیگا۔ گویا عراق اب پوری طرح آزاد ہے اور مشرق وسطیٰ کے متوقع دفاعی سلسلے کی بنیادی کڑی۔ ہم اس کامیابی پر عراق کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ آزادی ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے لئے نیک فال ثابت ہو۔

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ۔

۴۰۰ صفحات　　قیمت ۴ روپے

بین الاقوامی جائزہ

معاہدات پیرس کی تصدیق کی بدولت مغربی جرمنی آزاد ہو کر ناٹو کا رکن بن چکا ہے۔ اس طرح اس دفاعی تنظیم میں نئی جان پڑ جانے کی توقع پیدا ہو گئی ہے کیونکہ اب جرمن افواج بھی اس میں شریک ہو جائیں گی۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جسے روس لباس حقیقت سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اب اس نے حصول مقصد کے لئے نئی نئی چالیں چلنا شروع کر دی ہیں۔ اس نے بظاہر امن پسندی کے عملی ثبوت دینے شروع کر دیئے ہیں۔ وہ اقوام مغرب کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتا ہے کہ روس مصالحت پر اتر آیا ہے۔ اور اس طرح انہیں انکی ان کی دفاعی تنظیموں کو معطل بنا دینا چاہتا ہے نیز اس سے وہ یہ فضا پیدا کر دینا چاہتا ہے کہ چونکہ روس آمادہ بہ صلح ہے لہذا اقوام مغرب کو چاہیئے کہ لے زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر امن کے راستے سے ہٹنے نہ دیں۔ اسی کا نتیجہ ہو کہ اقوام مغرب کے ہاں جب مشرق و مغرب کی کشیدگی کو کم کرنے پر گفتگو ہوتی ہے تو تان یہیں پر ٹوٹتی ہے کہ روس کو راضی کر لیا جائے اور اس کے مطالبات مان لئے جائیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو معاہدات پیرس کی تصدیق سے اقوام مغرب کی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے۔ انہوں نے اگر اس کا فائدہ نہ اٹھایا۔ اور روس کے معاملہ میں جرأت کا ثبوت نہ دیا۔ تو وہ مات کھا جائیں گی۔

آسٹریا سترہ سال سے غلام چلا آ رہا ہے۔ یہ سب سے پہلا ملک ہے جس پر ہٹلر کی فوجوں نے یلغار کی تھی۔ سات سال جرمنوں کی غلامی میں رہنے کے بعد دس سال سے یہ ملک دول اربعہ کے فوجی قبضے میں ہے۔ یوں تو اس کا معاہدہ ۱۹۴۹ء میں ہی تیار ہو گیا تھا لیکن روس نے عندیہ آ کر اسے ٹھکرا دیا۔ اب روس نے خود ہی اس معاہدہ کے لئے قدم اٹھایا۔ اور آسٹریا کے چانسلر کو ماسکو بلا کر اس سے غیر جانبدار رہنے کی ضمانت لے کر معاہدہ کی تفاصیل طے کر لیں۔ اس معاہدہ پر دوسری آنا میں امریکہ، برطانیہ، فرانس روس اور آسٹریا کے نمائندوں کے مابین ضروری مذاکرات ہو چکے ہیں۔ اور روس نے معمولی رد و کد کے بعد اقوام مغرب کی شرائط مان کر معاہدہ امن پر دستخط کر دیئے ہیں۔

اس معاہدے نے جو فضا پیدا کی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے روس کو دعوت دی ہے کہ وہ عالمی مسائل کے تصفیہ کے لئے اعلیٰ چار طاقتی کانفرنس میں شریک ہو۔ روس نے اس دعوت کو قبول بھی کر لیا ہے۔ اب تک کانفرنس کی مخالفت امریکہ کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب صدر آئزن ہاور نے اس کی منظوری دے دی ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اگر ایسی کانفرنس سے عالمی امن کی ہلکی سی امید بھی وابستہ کی جا سکتی ہے تو وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ خیال یہ ہے کہ صدر آئزن ہاور، وزیر اعظم ایڈن، وزیر اعظم فرانس اور وزیر اعظم مارشل بلگانن جولائی میں دو تین دن کی ملاقات کریں گے ان کے ساتھ وزرائے خارجہ بھی ہوں گے۔ اور وہی دراصل متعلقہ مسائل کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

روس نے اپنی سخت پالیسی کو تحدید اسلحہ کے سلسلہ میں بھی نرم کیا ہے۔ لندن میں پانچ ممالک (امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور کنیڈا) کی جو کانفرنس گزشتہ تین ماہ سے تحدید اسلحہ کے ذرائع پر غور و خوض کر رہی ہے۔ اس میں روس نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ اس کے سابقہ موقف سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اور ان میں مغربی مطالبات کو ماننے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً تحدید افواج سے متعلق مغرب کی تجویز یہ تھی کہ امریکہ، روس اور چین کی فوجوں کی تعداد فرداً فرداً دس سے پندرہ لاکھ کے درمیان ہو۔ اور برطانیہ اور فرانس کی ساڑھے چھ لاکھ۔ روس آج تک اسے مسترد کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اب اس نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ اسی طرح مغرب کی تجویز تھی کہ ایٹمی اسلحہ کی تحدید و امتناع کا سلسلہ اس وقت شروع ہو جب غیر ایٹمی اسلحہ کی تحدید عمل میں پوری طرح لائی جا چکی ہو۔ روس کا مطالبہ یہ تھا کہ دونوں مراحل بیک وقت شروع ہوں۔ یا زیادہ سے زیادہ پچاس فی صدی تخفیف کے بعد اس کی وجہ یہ تھی کہ روس اقوام مغرب کی ایٹمی برتری کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اب مفاہمت یہ ہوئی ہے کہ غیر ایٹمی اسلحہ پچھتر فیصدی کم ہو جائیں تو ایٹمی اسلحہ کو ممنوع قرار دیدیا جائے۔

روس کی اس مفاہمت پسندی کے بعد تحدید اسلحہ کے سلسلہ میں توجہات کا مرکز اقوام مغرب کی یہ تجویز ہو گئی ہے کہ جو ادارہ تحدید کی نگرانی کرے، اسے چند در چند اختیارات حاصل ہوں، مثلاً وہ بلا روک ٹوک تمام ممالک متعلقہ میں جا سکے۔ اسلحہ کے ذخیرے وغیرہ دیکھ سکے انہیں سفر کی پوری آسانیاں دی جائیں۔ وہ ہر طرح محفوظ ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ روس نے اس پر اپنی رائے کا اظہار ابھی نہیں کیا۔ اگر تحدید اسلحہ کانفرنس واقعی کسی قابل عمل فارمولے پر متفق ہو گئی تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے روس کی یہ امن پسندی تبدیلی قلب کی آئینہ دار نہیں بلکہ یہ طریق کار کی تبدیلی ہے۔ وہ اب اس کوشش میں مصروف ہے کہ اقوام مغرب کو امن کا سراب دکھا کر دفاعی تنظیموں کی عملی تشکیل سے روکے۔ اور ان کے حلیفوں کے دل میں غیر جانبداری کے خیالات پیدا کرے۔ جوں جوں غیر جانبداری کا حلقہ وسیع ہوگا اقوام مغرب کا اثر و دخل کم ہوتا جائے گا۔ اور روس کا اثر و نفوذ بڑھتا جائے گا۔ آسٹریا کو روس نے غیر جانبدار بنایا ہے۔ دراصل اس نے جرمنی کی خاطر یہ مجاز جمع بنایا ہے۔ اب مشرق و مغرب کی جو کانفرنسیں ہونگی ان میں جرمنی کی وحدت کا مسئلہ خصوصیت سے سامنے آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ روس اس کے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

تاریخی شواہد

(۱۵)

قوانینِ خداوندی سے بغاوت اور اپنے سرکش و جابر اربابِ حکومت کا اتباع۔ یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ (۱۱/۵۹)

یہ ہے سرگذشت عاد کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی۔

بالآخر جور و استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہو گئی اور سنت اللہ (قانون مکافات) کے مطابق ان کی غلط روش زندگی کے ظہورِ نتائج کا وقت قریب آپہنچا تو آخری کوشش کے طور پر ان کی طرف انہی میں سے ایک رسول (حضرت ہودؑ) کو بھیجا گیا۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (۷/۶۵ نیز ۱۱/۵۰ ؛ ۲۶/۱۲۴ ؛ ۴۶/۲۱)

اور (اسی طرح) ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے قوم! اللہ کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟

آپ آئیے اور اس سرکش و متمرد قوم کو اسی پیغامِ ازلی کی دعوت دی جو ہدایتِ آسمانی کی اصل و اساس ہے یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزاوار فقط ایک ذات باری تعالیٰ ہے

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (۷/۶۵)

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا اے قوم! اللہ ہی کی محکومیت و اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟"

سورۂ ہودؑ میں ہے:

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝ (۱۱/۵۰)

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا۔ اے قوم! اللہ ہی کی محکومیت و اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (یعنی حاکم اور مالک نہیں اس کے سوا تم جو بھی عقیدہ رکھو، وہ باطل، گمراہ کن اور افترا کا خود ساختہ ہے۔

سورۂ احقاف میں ہے۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۴۶/۲۱)

اور (اے پیغمبر! ذرا) قوم عاد کے بھائی بند (ہود) کے واقعات کو سامنے لاؤ جب اس نے اپنی قوم کو مقام احقاف (صحرائے عرب) میں (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) ڈرایا اور (کچھ اسی پر منحصر نہیں) اس سے پہلے اور اس کے بعد (اور بہت سے) ڈرانے والے (نبی) آچکے ہیں (وہاں تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کرو مگر صرف اللہ کی (کہ وہی تمہارا حاکم اور مالک ہے) اور (دیکھو) اگر تم اپنی غلط روش سے باز نہ آئے، تو) میں تمہارے متعلق ایک بڑے دن (یوم مکافاتِ عمل) کے عذاب سے ڈراتا ہوں (کہ وہ تمہیں آگھیرے)

قوم، قوت و سطوت کی مالک تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایتِ آسمانی کے اتباع سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم حکومت و دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زاویوں اور خانقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہودؑ نے اس باب میں ایک ایسی عظیم الشان حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباعِ قوانینِ الٰہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝ (۱۱/۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو! تم قوانینِ الٰہیہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ یعنی غلط روش چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کرو۔ وہ تم سب پر برستے ہوئے بادل بھیج دے گا (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جائیں گے) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھا دے گا (کہ روز بروز گھٹنے اور کمزور ہونے کی جگہ اور زیادہ بڑھتے اور قوی ہوتے جاؤ گے) اور (دیکھو) مجرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو۔

یہ ہے عظیم الشان فرق آسمانی ہدایت اور ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ تصورِ مذہبیت میں۔ ذہنِ انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یکجا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ دُنیا سے مراد ہے قوت و سطوت، دولت و حشمت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دین داری سے مفہوم ہے بے کسی و بے چارگی۔ عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی۔ یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگواریوں سے نفرت کی جائے اور ترکِ لذائذ سے پرہیزگاری کو مقصدِ حیات قرار دیا جائے۔ لیکن یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ دُنیا بھر کے سرکش و متمرد انسانوں سے قوت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعتِ مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دے دی جائے جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے۔ بلکہ قوانینِ خداوندی کے ماتحت نظم و ضبطِ عالم کو ترتیب دے۔ اور تمام نعمائے دنیا کو نوعِ انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے عام کر دے۔ (تفصیل ان اشارات کی اپنے مقام پر آئے گی) حضرت ہودؑ نے یہی فرمایا کہ میں جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ فقط نظامِ معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اور اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہوگی کہ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ (۲۶/۱۲۵-۱۲۶ و ۲۶/۱۳۱)

میں تمہارے لئے ایک امانت دار (خدا کا) پیغامبر ہوں۔ تو تم اللہ کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اور اس کے لئے میری (یعنی ان احکام کی جو میں خدا کی طرف سے تمہیں پہنچا رہا ہوں) اطاعت کرو!

غور کیجئے۔ منصبِ رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ نہیں۔ بلکہ اس حکومتِ خداوندی کے مرکزِ اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۲۷ نیز ۱۱/۵۱)

میں اس بات کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو صرف پروردگارِ عالم پر ہے (اور بس)

یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہودؑ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان، جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کس طرح اس نظام کو قبول کر لیں! سب سے پہلی تکذیب حسبِ معمول قوم کے سرداروں کی طرف سے ہوئی۔ انہی سرداروں کی طرف سے جن کے گھروں میں "برتن بھرے ہوئے تھے":

نوادرات۔ علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات، سرحدات پر متمدن مملکتوں کے وجود، عربوں میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ اور عربوں کی قومی خصائل و امتیازات سے بحث کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ عربوں کا عقل کے اعتبار سے کیا مقام تھا۔ آج کی فرصت میں عربوں کے اس عقلی مقام سے متعلق ابن خلدون اور ادلیری کی آراء پیش کی جا رہی ہیں۔

عربوں کی انفرادی حریت اس درجہ شدید تھی کہ وہ کسی قسم کی پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ کسی کے ماتحت ہو کر رہ سکتے تھے۔ ہر تسلط کے خلاف ان کی برافروختگی۔ جو ان کی حریت پر پابندی عاید کرتی ہو، خواہ وہ خود ان کی مصلحت کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ وہ راز کی کنجی ہے جو ہمارے لئے ان تمام جرائم اور خیانتوں کی تفسیر کر دیتی ہے۔ جو عربی تاریخ کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہے اس مذکورہ جاننے کے سبب ہمارے عہد کی اکثر یورپین طاقتیں بڑی غلطیوں میں پڑ گئی ہیں۔ جس کے لئے انھیں بڑی قربانیاں دینی پڑیں اگر انھیں یہ راز معلوم ہوتا۔ تو وہ ان حماقتوں سے بچ سکتی تھیں عرب اقوام کی قیادت کی دشواریوں اور ان کا کسی قسم کے تسلط سے زیر نہ ہونا ہی وہ بڑا سبب ہے۔ جو ان کے لئے مغربی تہذیب کی راہ اختیار کرنے سے اب تک مانع رہا ہے۔ ایک عربی النسل آدمی اپنی حریت اور آزادی سے کس قدر والہانہ محبت کرتا ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جونہی کسی نے اس کی آزادی پر حد بندیاں لگائیں یا اس کی حریت کو کم کرنے کی کوشش کی تو وہ اس وحشی بھوکے شیر کی طرح برافروختہ ہو جاتا ہے جسے کسی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اور وہ پاگلوں کی طرح ان بندشوں کی شکست و ریخت اور دوبارہ اپنی آزادی کے حصول کے لئے پرجوش طریقہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک عربی شخص دوسری طرف اپنی قبائلی تقلیدات کا صد درجہ مخلص اور مطیع بھی ہو جاتا ہے۔ وہ سخی ہوتا ہے۔ مہمان نوازی کے واجبات اور جنگی معاہدات کو کما حقہ ادا کرتا ہے۔ دوستی کے فرائض و واجبات کو بھی وہ عرف عام کے مطابق نہایت خلوص کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ لیکن بظاہر عموماً یہ صفات و خصوصیات ایسی ہیں جو اسی قسم کے اجتماعی ارتقا ہی کی عام صفات و خصوصیات شمار کی جا سکتی ہیں، نہ کہ کسی خاص قبیلہ کی خصوصی صفات۔ چنانچہ جب یہی عرب کسی مقام کے باشندے بن جائیں۔ مثلاً زرعی زندگی اختیار کر لیں۔ تو اس عقلیت میں ایک اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

۵ــــ اس کے علاوہ مصنفین کے اور بھی بہت سے اقوال ایسی لٹریری کتابوں میں موجود ہیں۔ جن میں وہ ہر فضیلت کو عربوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور ہر برائی کی ان سے نفی کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر آلوسی کا وہ بیان ملاحظہ کیجئے۔ جو بلوغ الارب[1] میں درج کیا ہے۔ چنانچہ طویل گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ چونکہ عرب اقوام کا عقل و شعور سب لوگوں سے مکمل تر اور ان کی زبانیں سب سے شیریں تر اور ان کا فہم و ادراک وافر تھا۔ اس لئے ہر فضیلت ان میں پیدا ہو گئی۔ اور وہ ہر منقبت جلیلہ کے وارث بنتے چلے گئے۔ نیز ابن رشیق نے "عمدہ" میں لکھا ہے کہ عرب لوگ تمام اقوام سے افضل ترین قوم تھے۔ اور ان کی حکمت تمام حکمتوں سے اشرف ترین حکمت تھی۔ الخ

مذکورہ بالا آراء کا اختلاف

ہم عربوں کی تقدیس کے معتقد نہیں ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے اقوال ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جو ان کے شرف و فضل کے گن گاتے ہیں۔ اور ہر کمال سے انھیں متصف اور ہر نقص سے انھیں منزہ قرار دیدیں۔ کیونکہ اس قسم کے اقوال ایک علمی بحث کا مرکز نہیں بن سکتے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ عرب بھی ایک قوم ہیں۔ جیسے دنیا کی اور بہت سی قومیں ہیں۔ ان کے اپنے کچھ خصائص و امتیازات ہیں جب کہ ان میں کچھ عیوب بھی ہیں، ان کی عقلیت، نفسیت، آداب، تاریخ غرضکہ ان کی ہر چیز ہر قسم کی علمی تنقید کے تحت لائی جا سکتی ہے جیسا کہ دوسری قوموں کی یہ تمام چیزیں علمی تنقید کا نشانہ بن سکتی ہیں لہٰذا وہ قول جس کا نمونہ پانچویں رائے نے پیش کیا ہے کسی قسم کی بحث و نزاع کا مستحق نہیں بن سکتا۔ اسی طرح علمائے شعوبین یعنی علمائے عمرانیات کی پہلی رائے ــ تو ان حضرات نے بھی غلطی کی ہے۔ جو عربوں سے یونانی فلسفہ کی طرح ایک فلسفہ کے متوقع ہیں۔ اور رومی قانون کی طرح ایک قانون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں دیباج جیسی صنعتوں میں ماہر ہونا چاہئے تھا۔ یا اصطرلاب جیسی اختراعات کرنی چاہئے تھیں۔ کیونکہ اگر وہ ان قوموں کا مقابلہ جاہلی عربوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو یہ مقابلہ نہایت ہی غلط ہے۔ مختلف قوموں میں مقابلہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ تہذیب و تمدن کے ایک ہی مرتبہ پر فائز ہوں۔ ایک ایسی قوم میں جو تمدن کی پہلی سیڑھی پر اپنا پہلا قدم رکھ رہی ہو۔ اور ایک ایسی قوم میں جو پوری طرح متمدن ہو چکی ہو۔ قطعاً کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس قسم کا مقابلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک آدمی کی بچپن کی عقل اور زمانہ کہولت کی عقل میں مقابلہ کیا جائے۔ یہ تمام اقوام یعنی ایرانی اور رومی بھی بدوی زندگی کے دور سے گذر چکی ہیں۔ جب کہ نہ ان کا کوئی فلسفہ تھا اور نہ کوئی اختراعات تھیں۔ البتہ اگر عرب اقوام کا مقابلہ ان اقوام کے ساتھ اس دور میں کیا جائے۔ جب کہ وہ تہذیب و تمدن سے آشنا ہو چکی تھی۔ تو کون انکار کر سکتا ہے کہ عربوں کے پاس قانون بھی تھا۔ اور اپنا ایک علم بھی تھا۔ اگرچہ وہ تھوڑا ہی سا تھا ــــ جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے ــــ لہٰذا بحث و نزاع صرف ان دو رایوں میں کی جا سکتی ہے۔ جسے ابن خلدون اور ادلیری نے پیش کیا ہے۔

ابن خلدون کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی قوم ایک وحشی قوم ہے۔ لوٹ مار کرنے والی قوم۔ جب کسی مملکت کو وہ اپنا تابع فرمان کر لیتی ہے۔ تو وہ مملکت بہت جلد برباد ہو جاتی ہے۔ کسی رئیس کی اطاعت کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے۔ نہ وہ کسی قسم کی صنعت عمدگی سے چلا سکتی ہے۔ اور نہ ہی علمی میدان میں کوئی خوبی پیدا کر سکتی ہے۔ اور نہ ہی اس قوم میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ صنعتی اور علمی میدانوں میں عمدگی کے ساتھ کوئی کام انجام دے سکے۔ البتہ اس قوم کی طبائع سلیم ہیں جو خیر کے لئے مستعد ہوتی ہیں اور فطری طور پر یہ لوگ بہادر اور شجاع ہوتے ہیں۔

ادلیری کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی قوم ایک مادی قوم ہے جس کے خیالات تنگ اور جذبات جامد ہوتے ہیں۔ اسے اپنی عزت و حریت کا احساس نہایت شدومد سے ہوتا ہے۔ کسی قسم کا تسلط اور تغلب برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ سخی ہوتے ہیں اور قبائلی تقلیدات کے بہت مخلص ہوتے ہیں۔

یہ دونوں حضرات عربوں کے ان دو اوصاف میں متفق ہیں کہ عرب قوم ایک مادی قوم ہے۔ اور نیز یہ کہ کسی قسم کا تسلط برداشت نہیں کرتی۔ دوسرے وصف میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے ادلیری نے "بالکل صحیح کہا ہے کہ" یہی وہ صفت ہے جو ان تمام جرائم اور خیانتوں کی ہمارے لئے تشریح کر دیتی ہے تاریخ عرب کے ایک بہت بڑے حصہ پر حاوی ہیں" رہ گئی عربوں کی مادیت تو اکثر مستشرقین نے ابن خلدون اور ادلیری کی تائید کی ہے کہ عربوں میں مادیت کا وصف موجود تھا۔ چنانچہ استاد براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ الادب عند الفرس" میں بھی یہی لکھا ہے۔ اس صفت سے ان لوگوں کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ عربوں کے نزدیک صرف مادہ کی ہی قدر و قیمت ہے۔ یعنی وہ روپیہ پیسہ ہی کی قدر و قیمت جانتے ہیں، دوسری معنوی چیزیں تو ان کی نگاہوں میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ یہ وصف آج بھی بعض بادیہ نشین عربوں میں کھلا کھلا تمہیں نظر آجائے گا۔ لیکن کیا یہ ایسا وصف ہے جو زمانہ جاہلیت کے عربوں میں عام طور سے پایا جاتا ہو؟ اس میں ہمیں شک ہے۔ سخاوت اور وفا کی جو حکایات لٹریری کتابوں میں نقل کی جاتی ہیں۔ اگر وہ صحیح ہیں نیز قبائلی تقلیدات کی حفاظت میں جب ہنستے کھیلتے اپنی جانوں کو قربان کر دینا اگر قابل اعتماد ہے۔ تو یہ چیزیں مادیت کے قطعاً منافی ہیں۔ اس لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ عربوں کا وصف بیان کرنے میں ابن خلدون اور ادلیری دونوں ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کا عربی شخص زمانہ اسلام کے عربی شخص سے بہت مختلف ہوتا تھا۔ بلکہ جاہلیت کے زمانہ کا بھی عربی شخص اگر متمدن ہوتا تھا تو وہ بادیہ نشین سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ آج کل کے بادیہ نشین عرب بہت سی باتوں میں زمانہ جاہلیت کے بادیہ نشینوں سے قطعاً مختلف ہیں۔

اسلامی معاشرت
صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

[1] بلوغ الارب صہ ۱۴۴ ج ۱

مجلسِ اقبالؔ

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید)

تمہید کے ابتدائی اشعار میں اقبالؔ نے بتایا ہے کہ بصیرت قرآنی سے اس کی نگاہوں میں وہ وسعت اور گہرائی پیدا ہو چکی ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رموز و اسرار کو بے نقاب دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ چونکہ مجھے حقائق کائنات بیان کرنے ہیں اس لئے میں نے آرٹ کی اس بساط کو الٹ دیا ہے جس کا مقصد قوم کو زندگی کی سطحی رنگینیوں میں الجھائے رکھنا تھا۔

محفلِ رامش گری برہم زدم
زخمہ بر تارِ رگِ عالم زدم

میری نوائے انقلاب نے رقص و سرود کی ان کہنہ محفلوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ میں بربط و سرود کے تاروں کے بجائے، خود رگِ کائنات کو چھیڑتا ہوں اور میری مضراب اس میں پوشیدہ نغموں کو فضائے عالم میں مشہود کرتی ہے۔ لیکن یہی میری مشکل بھی ہے۔ میرے ہم جلیس (جن کے کان انہیں پرانے نغموں کے خوگر ہو چکے ہیں) اس "موسیقیٔ جدید" سے یکسر ناآشنا ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

بسکہ عودِ فطرتم نادر نواست		ہم نشیں از نغمہ ام ناآشناست

چونکہ میری فطرت کا ساز بالکل نادر اور "اچھوتے" نغمے پیدا کرتا ہے۔ اس لئے میرے ہم صفیر او ہم نشین حیران ہیں کہ میں کس دیس کی بولی بول رہا ہوں۔ ان حالات کے ماتحت، میری حالت یہ ہے کہ

در جہاں خورشیدِ نو زائیدہ ام		رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام

میں دنیا میں ایک آفتابِ تازہ ہوں جسے بطنِ گیتی ابھی ابھی منصۂ شہود پر لائی ہے۔ میں ابھی اس آسمان کے قواعد و ضوابط اور آئین و رسوم سے واقف نہیں ہوں۔

رم نمیدہ انجم از تابم ہنوز		ہست ناآشفتہ سیمابم ہنوز

اس آسمان کے ستارے میری حرارت سامانیوں سے متاثر ہو کر مائل بہ حرکت نہیں ہوئے۔ ابھی میرا سیماب (کہ جس کی فطرت میں بےتابی ہوتی ہے) متحرک نہیں بلکہ جامد ہے۔ میں جس بستی میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے آیا ہوں وہاں کے رہنے والے خوابِ غفلت میں سو رہے ہیں اور ان میں زندگی اور حرکت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔

بحر از رقصِ ضیایم بے نصیب		کوہ از رنگِ حنایم بے نصیب

جب سورج چڑھتا ہے تو اس کی پہلی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچتی ہیں اور ان کا دو پہلی عکس نہر و دیدہ بینا کو مستنیر کرتا ہے لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں طلوع ہو چکا ہوں۔ لیکن عصرِ حاضر کا سمندر میری شعاعِ فکر کے رقص سے یکسر ناآشنا ہے۔

جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی لالہ گوں سرخی پہاڑ کی چوٹیوں کو حنا آلود بنا دیتی ہے۔ شفق کی رنگینی تمام بلندیوں پر پھیل جاتی ہے۔ لیکن میری حالت یہ ہے کہ میرے زمانہ کی بلندیاں میری رنگینیٔ فکر سے یکسر محروم ہیں۔ میرے ہم عصروں کو پتہ ہی نہیں کہ میں ان کے لئے کس قسم کی تابندگی و درخشندگی کے سامان لے کر آیا ہوں۔

خوگرِ من نیست چشمِ ہست و بود		لرزہ بر تن خیزدم از بیمِ نمود

اس دنیا کی آنکھ ابھی مجھ سے بالکل ناآشنا ہے اس لئے اس خیال سے کہ میں اس ناآشنا دنیا کے سامنے کس طرح آؤں، میرے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

بامم از خاور رسید و شب شکست		شبنمِ نو بر گلِ عالم نشست

انتظارِ صبح خیزاں می کشم		اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

عام قاعدہ ہے کہ جب رات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور صبح کا سپیدہ نمودار ہونے کو آتا ہے تو صبح کے وقت اٹھنے والے از خود بیدار ہو جاتے ہیں اور آفتاب کی ضیاپاشیوں سے متمتع ہونے لگ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ رات کبھی کی ختم ہو چکی ہے اور میری صبح کب سے نمودار ہو چکی ہے۔ اور کب سے گلہائے کائنات، نئی شبنم کے قطروں سے اپنے منہ دھو چکے ہیں لیکن میں ابھی تک صبح کے وقت اٹھنے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ یعنی میں تو روشنی اور بصیرت کے پورے سامان اپنے ساتھ لے کر آ چکا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی آنکھ ایسی نظر نہیں آتی جو اس روشنی سے متمتع ہو سکے۔ میرے سوزِ قلب کی آگ مدت سے روشن ہے۔ لیکن اس آگ کا پرستار ابھی تک کوئی نہیں پیدا ہوا۔

کس قدر خوش بخت ہوں گے وہ لوگ جو اس آگ کی حرارت سے اپنے سینہ کو آتشکدہ بنا لیں حقیقت یہ ہے کہ میں وہ نغمہ نہیں جو بربط کے تاروں کے اندر خاموش پڑا بیٹھا ہو اور جب تک کسی مضراب زن کی انگلیاں ان تاروں کو نہ چھیڑیں، وہ ساز کے پردوں سے باہر ہی نہ آئے۔ میں وہ نغمہ ہوں جو بلا منتِ مضراب فضا کو مرتعش کرتا چلا جاتا ہے۔ میری نوائے شوق کو ساز و سامان کی ضرورت ہی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں قبل از وقت اس محفل میں آ گیا ہوں۔ میری بات میرے ہم عصر نہیں، بلکہ بعد میں آنے والے سمجھ سکیں گے۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم		من نوائے شاعرِ فرداستم

اس لئے کہ

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست		یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

جس زمانہ میں میں پیدا ہوا ہوں یہ حقائق کائنات سے بالکل بے بہرہ ہے۔ میرا یوسفِ فکر اس بازار کے لئے تھا ہی نہیں۔ اس کے خریدار کسی اور بازار میں ملیں گے۔

ناامیدستم ز یارانِ قدیم		طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

میں ان یارانِ قدیم سے ناامید ہوں۔ ان کی عمریں، جمود و تعطل میں گزری ہیں۔ ان کے لئے فکر و عمل کی دنیا میں ادنیٰ سا تغیر پیدا کرنا بھی محال ہے۔ اور میں اس ساری بساط کے الٹنے اور بالکل بساطِ جدید بچھانے کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس لئے مجھے ان شاعرانِ کہنہ سے کیا امید ہو سکتی ہے؟ ایک زمانہ وہ تھا کہ طور پر آگ کی پہلی چمک دکھائی دی اور وہاں کلیم آ موجود ہوا۔ اور ایک یہ میرا زمانہ ہے کہ میرے سینہ کا طور اس کلیم کے لئے آتش بداماں ہے جو ہنوز پیدا ہونے والا ہے۔ یہ اس انتظار میں جل رہا ہے کہ کبھی نہ کبھی، کوئی کلیم تو آئے ہی گا۔

اقبالؔ کو پہلے دن سے اس کا احساس تھا کہ اس کا پیغام قبل از وقت ہے۔ اس کا زمانہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انقلاب آفریں پیغام اپنے زمانہ سے پہلے آیا کرتا ہے۔ پیغام دینے والا (عام دنیاوی معیاروں کے مطابق) ناکام چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کا پیغام ایک تخمِ صالح کی طرح زمین گیر ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک شجرِ طیب کی طرح بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا چلا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ انقلاب، حقائقِ عالم کی صحیح بنیادوں پر استوار ہو اور اس کا مقصود نوعِ انسانی کی منفعت بخشی ہو۔ اقبالؔ نے اپنی تنہائی کا جو شکوہ پہلے دن کیا تھا اسے وہ تمام عمر دہراتا رہا۔ اور مرتے وقت بھی یہ کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوا کہ

چوں رخت خویش بربستم ازیں خاک		ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر		چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

لیکن اسے اس کا احساس (بلکہ یقین تھا) کہ اس کے پیغام کا یہ تخمِ صالح، برگ و بار لائے بغیر نہیں رہے گا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبالؔ پر اپنی قسم کی پہلی کتاب
اقبالؔ اور قرآن
از پرویزؔ

عورت کا قرآن

(۱۳)

(۴) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ
بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ　　(بقرہ رکوع ۲۱)

اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کردی ہیں وہ تو صرف یہی ہیں کہ "مُردار جانور، خون، سور کا گوشت، اور وہ جو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی سے نامزد کیا گیا ہو۔ بس۔ اب اگر ایسی حالت پیش آجائے کہ کوئی آدمی بھوک سے بیتاب ہو اور مقصود نہ تو لذت ہو اور نہ خدائی حدود کو توڑنا، تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں۔ اگر وہ یہ چیزیں بھی کھالے اللہ ہی بڑا سامان حفاظت و پرورش بخشنے والا ہے۔

(۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ　　(مائدہ رکوع ۱۲)

اے مسلمانو! خدا نے جو چیزیں تم پر حلال کردی ہیں۔ انہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو۔ اور (روک ٹوک میں) حد سے نہ گزرو۔ اللہ حد سے گزرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۶) وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ
لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ وَإِنَّ كَثِيرًا
لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِم بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ
(انعام ع ۱۴)

اور تم کو کون سا امر اس کا باعث ہوسکتا ہے کہ تم اس جانور کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ تم پر جو کچھ حرام کیا گیا ہے وہ اللہ نے تم کو تفصیلاً بتلا دیا ہے۔ مگر وہ بھی، مجبوری کی حالت میں، تمہارے لئے حلال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ، بلا کسی سند کے محض اپنے غلط خیالات کی بنا پر لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ تمہارا پروردگار انہیں خوب اچھی طرح جانتا ہے جو حد سے نکل جانے والے ہیں۔

(۷) قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ
إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ
فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
(انعام رکوع ۱۸)

تم کہدو کہ جو وحی، میرے پاس بھیجی گئی ہے، میں اس میں تو کوئی حرام چیز نہیں پاتا کہ کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو، بجز اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں بلاشبہ گندی ہیں، یا پھر جو چیز گناہ کا موجب ہو، وہ، وہ ہے جو غیر اللہ سے نامزد کیا گیا ہو۔ پھر اگر کوئی شخص بیتاب ہو اور مقصود لذت یا نافرمانی نہ ہو تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار ہی حفاظت و پرورش کا سامان عطا کرنے والا ہے۔"

---

(۶)

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ
أَفْوَاجًا وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا وَسُيِّرَتِ
الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا　　(النبا رکوع ۱)

بیشک فیصلے کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ دن جس دن بگل پھونکا جائے گا۔ پھر تم لوگ گروہ در گروہ ہو ہوکر آؤ گے۔ اور بلندیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ چنانچہ ان میں دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے اور پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے سو وہ ریت کی طرح ہو جائیں گے

(۲) وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا مَن شَاءَ
اللَّهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ ۝ وَأَشْرَقَتِ
الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ
وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ
مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ　　(زمر رکوع ۷)

اور بگل پھونکا جائے گا سو تمام بلندیوں اور پستیوں والوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔ الّا یہ کہ جس کو خدا چاہے پھر دوبارہ بگل پھونکا جائے گا تو دفعتاً سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے، دیکھنے لگیں گے اور زمین خدا کے نور سے روشن ہو جائے گی اور خدا کا قانون قائم کر دیا جائے گا۔ اور پیغمبر اور گواہ سب حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے"۔

---

(۷)

(۱) إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمْ
أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ۝　(فاطر رکوع ۴)

جو لوگ اللہ کی کتاب کا اتباع کرتے رہتے ہیں اور نظام صلوٰۃ کو قائم رکھتے ہیں اور جو ہماری دی ہوئی دولت کو مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ پوشیدہ طور پر بھی اور علانیہ طور پر بھی وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ پڑے گی تاکہ وہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج پورے پورے دیدے ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ بھی دے۔ بیشک وہی مخالف طاقتوں سے حفاظت کا سامان اور پرورش و آسائش کے لئے ربوبیت کے سامان بخشنے والا ہے۔

(۲) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ
عَمَلًا ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ
يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا
خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ
نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا　　(کہف رکوع ۴)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے صلاحیت بخش کام کئے تو ہم ایسیوں کا...... کا اجر ضائع نہ کریں گے جو معاشرہ میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے والے کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے وہ سدا بہار باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ لوگ سبز رنگ کے باریک اور دبیز ریشم کے کپڑے پہنیں گے اور وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ واقعی یہ کیا ہی اچھا صلہ اور کیا ہی اچھی جگہ ہے؟

اسلام کا نظام معاشرت کیا ہے؟
اور وہ کیسے متشکل ہو سکتا ہے؟
اس کا جواب
نظام ربوبیت میں ملاحظہ کیجئے۔

سب سے پہلے اور سب سے بڑے مفسّر

ابو جعفر محمّد بن جریر الطبری

(از علامہ تمنّا عمادی مدظلہٗ)

۲

مجھے تو یقین ہے کہ شیعہ حضرات نے جب سیاسی طاقت پیدا کی اور اپنے مذہب کی الگ تدوین شروع کر دی اور اپنی حدیث و تفسیر وغیرہ کی کتابیں بھی الگ کر لیں، اور ان کا حصّہ رسدی جو اہل سنت کی کتابوں میں رہ گیا تھا یعنی ان کی حدیثیں جو اہل سنت نے اپنی کتابوں میں صرف اس لئے درج کر لی تھیں کہ الگ الگ دو فرقے نہ ہو جائیں اور ان کی دلجوئی بھی ہوتی رہے۔ وہ ساری کی ساری حدیثیں اہل سنت کے سر منڈھ گئیں جن کے متعلق اب شیعہ حضرات کہا کرتے ہیں کہ تمہاری کتابوں میں بھی تو فلاں فلاں روایتیں موجود ہیں۔ حالانکہ وہ خود انہی کی دی ہوئی حدیثیں ہیں۔ ورنہ وہ بتائیں کہ جب بخاری و مسلم مدوّن ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کی کون سی کتاب تھی؟ یہاں تک کہ مستدرک حاکم جو خاص شیعہ کی کتاب ہے اور صاحب مستدرک بالاتفاق شیعہ تھے۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کا ترجمہ لکھتے ہوئے لکھا ہے "رافضی خبیث" کان شدید التعصب فی التشیع فی الباطن وکان یظہر التسنن فی التقدیم والخلافۃ یعنی ابو عبد اللہ الحاکم صاحب مستدرک رافضی تھے، شیعیت کے تعصب میں باطن بہت سخت تھے اور سنی ہونا ظاہر کرتے تھے۔ شیخین کو مقدم ظاہر کر کے اور خلافت کا اقرار کر کے، الخ مگر یہ بھی اپنی کتاب مستدرک کے ساتھ اہل سنت ہی کے سر ہے۔ بعض شیعہ راویان حدیث کے نام ہی بدل گئے۔ کہیں حروف کا فرق کہیں نقطوں کا فرق۔ کہیں نسبت کا فرق، کہیں ولدیت کا فرق پیدا کر دیا۔ اور کتنے شیعہ راویان حدیث سے شیعوں نے انکار کیا کہ وہ ہمارا راوی ہی نہیں۔ اس لئے کہ اب ان کو ان سے کوئی کام تو رہا نہیں۔ وہ تو ان کا کام کر گئے کہ ان کتابوں میں جو اہل سنت کے سر منڈھ گئی ہیں شیعوں کی حمایت میں حدیثیں بھر گئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو بھی ایک سے دو کر دیا گیا۔ اور صرف دادا کے نام کا فرق پیدا کر کے سنیّوں کو یہ دھوکا دیا گیا کہ ہمارا ابو جعفر طبری تو ابن جریر بن رستم ہے اور وہ جو مفسر و مؤرخ ہے۔ وہ ابن جریر بن یزید ہے اور وہ تمہارا ہے۔ ہم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں اس میں شیعوں کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا۔ کہ ابن جریر کی تفسیر و تاریخ میں جو روایتیں شیعوں کے موافق ہیں وہ سنیّوں کے خلاف سنیّوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں کہ دیکھو تمہارے مفسر اور تمہارے مؤرخ ایسا لکھ رہے ہیں۔ مگر یہ الزام اور اس طرح کی ترکیبیں جب کی گئیں کہ اہل سنت ان چیزوں کو اپنے گلے لگا چکے، اس لئے حقیقت حال یہی ہے کہ دونوں ابن جریر ایک ہی ہیں ہرگز دو نہیں اور بفرض محال دو ہوں بھی تو عین و غین کی صورت ایک ہی ہے اس لئے بہرحال دونوں ایک ہی ہیں۔

ابن جریر مفسر کے شیوخ ابن جریر مفسر کے شیوخ تو بہت ہیں مگر کیسے کیسے شیوخ ہیں ان کو وہی خوب جانتے ہیں جنھوں نے کتب رجال کی کافی سیر کی ہو اسی لئے امام حجر و امام ذہبی نے ان کے محض چند ہی شیوخ کے نام گنائے ہیں۔ جن میں محمد بن عبد الملک البصری متوفی سنہ ۲۴۴ھ۔ فلّاس متوفی سنہ ۲۴۹ھ۔ یعنی عمرو بن علی البصری۔ اسحاق بن ابی اسرائیل المروزی ثم البغدادی متوفی سنہ ۲۴۰ھ، ہنّاد بن السری الکوفی متوفی سنہ ۲۴۳ھ۔ ابو کریب محمد بن العلاء الکوفی الہمدانی متوفی سنہ ۲۴۳ھ اور ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ البصری متوفی سنہ ۲۵۰ھ یا سنہ ۲۵۱ھ یا سنہ ۲۵۲ھ (باختلاف اقوال) ایسے ہیں جن کو ائمہ حدیث و رجال ثقہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور جن سے صحاح میں روایتیں ہیں۔ ان لوگوں کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی دو بصری ہی ہیں یا ایک صاحب مرو کے رہنے والے عجمی ہیں جو بغداد میں آ بسے تھے۔ لیکن فلّاس اور محمد بن عبد الملک دو بصریوں کے سوا کسی کے ترجمے میں فہرست تلامذہ جہاں لکھی ہے وہاں ابن جریر طبری کا نام نہیں لکھا ہے مگر ابن جریر کے ترجمہ میں ابن جریر کے شیوخ میں ان سب حضرات کے اسمائے گرامی ضرور ملتے ہیں۔ بہرحال ابن جریر طبری کی ولادت سنہ ۲۲۴ھ کی ہے اور وفات سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی، اس لئے مذکورہ بالا اساتذہ میں سے صرف ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ ہی کا وقت یہ ایک حد تک پا سکے، اس لئے کہ ابو موسیٰ کی وفات کے وقت ان کی عمر چھبیس۲۶ یا ستائیس۲۷ یا اٹھائیس۲۸ برس کی تھی۔ باقی لوگوں میں سے فلّاس کی وفات کے وقت بھی یہ پچیس۲۵ سال کے ٹھہرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ تو کسی کی وفات کے وقت سولہ برس کے۔ کسی کی وفات کے وقت اٹھارہ۱۸ یا انیس۱۹ برس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان ثقہ حضرات سے روایتیں لینے کا فی الحقیقت موقع ہی کم ملا۔ اگرچہ ابو کریب سے یہ بہت روایت کیا کرتے ہیں۔ مگر ابو کریب کی وفات کے وقت یہ ہرگز انیس سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ اور ابو کریب تو کوفی بھی تھے اور ہمدانی بھی۔

محمد بن حمید بن حیان الرازی ابن جریر کے شیوخ میں ان کا نام لکھا ہے، ان کے متعلق امام بخاری کہتے ہیں۔ فیہ نظر۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں، ان کے پاس منکر روایتیں بہت ہیں۔ امام نسائی نے کہا کہ غیر ثقہ ہیں۔ علامہ جوزجانی نے کہا کہ ردی المذہب ہیں، غیر ثقہ ہیں۔ صالح بن محمد الاسدی مشہور محدث فرماتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس قدر ڈھیٹ کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ دوسروں کی حدیثوں کو لے لیا کرتے تھے اور ان میں الٹ پلٹ کر لیا کرتے تھے یہ بھی کہا کہ مشاق جھوٹا دو آدمیوں جیسا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ ایک تو سلیمان الشاذکونی دوسرے محمد بن حمید امام ابو زرعہ نے اپنے بھتیجے سے ان کے متعلق کہا کہ یہ قصداً جھوٹی روایت کرتے تھے اور متعدد ائمہ رجال و حدیث نے ان کو کذاب کہا۔ تفصیل لسان المیزان و میزان الاعتدال میں طوالت کے ساتھ موجود ہے۔

اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری ابو محمد و ابو اسحاق الکوفی۔ یہ بھی ابن جریر کے مذکورہ اساتذہ خصوصی میں سے ہیں۔ ان کو لوگوں نے اسمٰعیل بن ابی کریمۃ السدّی مشہور مفسر مگر غالی شیعہ اور معروف کذاب اسمٰعیل بن عبد الرحمٰن بن ابی کریمہ السدّی کا نواسہ لکھا ہے جیسا کہ امام بخاری و امام مسلم و امام نسائی و ابن سعد وغیرہم نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے۔ اور ابو علی جیانی نے ان کو سدّی کا بھانجا لکھا ہے۔ مگر ان کو بقول ابو حاتم۔ سدّی کی قرابت قریبہ سے انکار تھا بہرحال سدّی ہی کی طرح بالاتفاق ان کو بھی سب نے شیعہ ہی تسلیم کیا ہے۔ مگر کوئی غالی شیعہ لکھتا ہے، کوئی غالی شیعہ۔ ابو بکر بن ابی شیبہ اور ہنّاد بن سری اس کو فاسق کہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اس سلف کو گالیاں دینے والے سے لوگ کیا حدیثیں لیتے ہیں، یہ شریک بن عبد اللہ الکوفی جو تشیع مفرط میں مشہور تھے ان کے شاگرد تھے۔ مگر ان سے بھی ایسی روایت کیا کرتے تھے۔ جو کوئی دوسرا ان کا شاگرد نہیں جانتا تھا

عباد بن یعقوب الاسدی الکوفی۔ نہایت غالی شیعہ تھے۔ شریک بن عبد اللہ الکوفی کے شاگرد رشید تھے۔ انھیں سے یہ روایت ہے کہ "میرے منبر پر معاویہ کو دیکھو تو اس کو قتل کر دو۔" اس قسم کے قول کا بہتان یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھتے تھے حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی شان میں کریہ الفاظ بولتے تھے، اور مناقب حضرت علی و حضرت فاطمہ و حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم میں جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے سنہ ۲۵۰ھ میں وفات پائی۔

اور جن اساتذہ ابن جریر کا نام ابن حجر وغیرہ نے نہیں لکھا ہے۔ وہ تو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں اس مختصر سی تحریر میں کہاں تک لکھا جائے۔ اہل حق کو چاہیے کہ تفسیر ابن جریر کو دیکھیں تو رجال کی کافی چھان بین کے بعد قرآنی سیاق و سباق سے ملاتے ہوئے تفسیری روایتوں کو دیکھیں اور ہرگز ہرگز کسی تفسیری روایت پر بلا تحقیق یقین نہ کر لیں۔ یہ واقعہ ہے کہ تفسیری روایات میں اسی فیصدی روایات محض کذب و افترا ہیں میرا یہ دعویٰ محض قیاسی یا تعصب یا بدگمانی پر مبنی نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے نہایت واضح دلائل موجود ہیں اور میں اپنے دعویٰ پر شہادتیں لکھتا ہوں۔ مثلاً ابن جریر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں (بصفحہ ۲۱ مطبوعہ مصر) ایک روایت لکھی ہے جس کو یوں شروع کیا گیا ہے حدثنی سعید بن الربیع مگر "سعید بن الربیع"

سلہ مثلاً مندل و حبان ابنا علی العنزی کو کتب رجال شیعہ اور کتب رجال اہل سنت میں ان کے حالات دیکھ لیجئے۔ شیعوں نے مندل کو جو وزن سے ہے "مبدل" بائے موحدہ تحتانیہ سے اور عنزی کو جو نون اور زائے معجمہ سے ہے عنزی تائے قرشت اور رائے مہملہ سے بدل دیا اسی طرح مندل کے بھائی حبان العنزی جو بائے موحدہ سے ہے اس کو یائے مثناۃ تحتانیہ سے بدل دیا۔ مگر یہاں عنزی کو علی حالہ رہنے دیا۔ کہ دونوں اپنے بھائی نہ سمجھے جائیں اسی طرح یزید بن معاویہ الکوفی شیعوں کا ایک بہت بڑا محدث تھا اس کو وہ پہلے تو برا نہیں سمجھتے تھے۔ متقدمین شیعہ کا نام یزید اور معاویہ ہوتا تھا بڑا رہے کے لیے تعصب بڑھا۔ تو یزید کو برید بائے موحدہ اور رائے مہملہ سے بنا لیا۔ چونکہ اس سے کچھ روایتیں ان کتابوں میں بھی ہیں جو اہل سنت کی کہی جاتی ہیں۔ ورنہ یزید اور معاویہ نام کے راویان حدیث ان کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں مگر ان سے اہل سنت کے سر منڈھی ہوئی کتابوں میں چونکہ کوئی روایت نہیں تھی اس لئے ان لوگوں کے نام نہیں بدلے اور اس طرح کی تبدیلی و تحریف کی مثال شیعوں کے یہاں بہت ملیں گی اگر اس کی جستجو میں تھوڑا وقت صرف کیا جائے۔

سلہ بچھلم کرنیوالے سے تو اکثر لوگ واقف ہیں کیونکہ کرد شیعوں کا خاص مرکز تھا اور ہمدانیوں کے حالات میں متعدد احادیث تبدیل سیپ کے متن میں لکھا ہوا ہے کہ ہمدانی بھی شیعوں کا ایک مستقل گروہ تھا۔ اور اب دیکھئے کہ ابو کریب سے شیعوں کے موافق بہت حدیثیں ملیں گی چنانچہ حدیث کسا کے

صرف ایک ہی راوی حدیث تھے جن کا پورا نام سعید بن الربیع الحرشی العامری البصری ہے۔ تہذیب التہذیب جلد ۴ میں حافظ ابن حجر نے ان کو اقدم شیخ البخاری لکھا ہے یعنی یہ امام بخاری کے سب سے قدیم ترین شیخ تھے۔ ان کی سال وفات ۲۱۱ھ دو سو گیارہ امام بخاری کی روایت سے لکھا ہے یعنی ابن جریر طبری کی ولادت سے تیرہ برس پہلے۔ کیونکہ ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی اور کوئی دوسرا راوی حدیث اس نام اور اس ولدیت کا کہیں ہے نہیں۔ تو پھر یہ حدثنی سعید بن الربیع کہہ کر ابن جریر کا کوئی حدیث روایت کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ بات خود بناتے تھے اور سلسلہ اسناد صحیح بخاری سے مستعار لے لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری کی اشاعت تو امام بخاری کی خواہش سے بھی زیادہ ان کے ان شاگردوں نے کی، جنہوں نے اس کی متعدد نقلیں کر کے حسب تعداد و حسب گنجائش تحریفوں کے ان ملکوں تک ان نسخوں کو پہنچایا جن ملکوں تک امام بخاری نہ جا سکے تھے اور ان لوگوں تک پہنچایا جو نہ امام بخاری کے پاس آئے نہ امام بخاری ان کے پاس پہنچے۔ مثلاً ابو جعفر ابن جریر الطبری کہ امام بخاری کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ابن جریر کی عمر ۳۲ برس کی تھی۔ امام بخاری خود عجمی تھے ان کے علم و فضل کا کافی شہرہ عجمی ملکوں میں ہو چکا تھا۔ اور وہ جس قدر علم کے حریص تھے، سب کو معلوم ہے۔ اگر امام بخاری کے دل میں کچھ بھی ابن جریر کی جگہ ہوتی۔ تو وہ ضرور ابن جریر کے پاس پہنچتے۔ اور ان سے بھی حدیثیں لیتے اور ابن جریر اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ امام بخاری کے تلامذہ کی صف میں داخل ہوتے۔ مگر صحیح بخاری سامنے رکھ کر اس سے اسناد حسب ضرورت ردوبدل کے ساتھ یا بجنسہٖ لے کر اپنی من گھڑت حدیثوں پر چسپاں کر دیا کرتے تھے لیکن امام بخاری کی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط و تاریخ صغیر کی تو اشاعت ہوئی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ آج بھی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط نہیں ملتی ہے۔ اس لئے امام بخاری کے کون شیخ کب وفات پا گئے۔ اس کی خبر ابن جریر کو پوری طرح نہ مل سکی، سعید بن الربیع اگرچہ ہروی الاصل یعنی ہرات کے رہنے والے تھے۔ مگر بصرہ میں آ کر رہ گئے تھے۔ اس لئے طبرستان کے رہنے والے ابن جریر کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سعید بن الربیع نے کب وفات پائی۔ یا ابھی زندہ ہیں یا نہیں۔ سمجھے کہ امام بخاری جو ہمارے ہمعصر ہیں جب ان سے روایت کر رہے ہیں۔ تو پھر ہم کیوں ان سے روایت نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جب وہ بھی عجمی ہی تھے، ہرات کے رہنے والے تھے جو خراسان کا ایک شہر ہے، غرض یہ کچھ سمجھ کر ابن جریر صاحب نے بھی حدثنی سعید بن الربیع لکھ مارا۔ اس واقعہ سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ ابن جریر اسناد حدیث گھڑا کرتے تھے، چھاپا کرتے تھے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی تھی، تو جو شخص جھوٹے اسناد گھڑ سکتا ہے کیا جھوٹی حدیثیں نہیں گھڑ سکتا؟ اگر تھوڑی محنت کی جائے تو ایسی مثالیں اور بھی یقیناً مل جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابن جریر کے تلامذہ | انسان اپنے ہم نشینوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ابن جریر کے شیوخ جو واقعی ان کے شیوخ تھے وہ یقیناً شیعہ ہی تھے۔ محدثین اپنے جذبہ مفاد و روایت پرستی کے لئے شیعہ و رافضی میں فرق کریں یہ ان کا اختیار ہے حقیقت میں تو ہر شیعہ کو رافضی ہی سمجھا جائے گا۔ غرض یہ کہ جب ان کے شیوخ کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے کہ کون واقعی ان کے شیخ تھے، اور کون ایسے تھے جن کے نام ابن جریر نے اپنے ہمعصروں کی کتابوں میں دیکھ کر اپنی حدیثوں میں جوڑ لئے تھے، تو یہ صورت شاگردوں میں تو نہیں ہو سکتی۔ شاگرد جو ان کے تھے وہ تو انہیں کے شاگرد تھے، اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ ان کے شاگرد کون کون لوگ تھے، یہ تو تھی ابن جریر کے شیوخ کی کیفیت۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ان کے شاگرد کس قسم کے تھے۔ ان کے متعلق میں طوالت سے بچنے کے لئے مختصر طور سے لکھتا ہوں۔

ابوبکر الشافعی کا نام بھی ابن حجر نے ابن جریر کے تلامذہ میں لکھا ہے۔ میں نے تاریخ مسند امام احمد میں ان کا پورا حال لکھا ہے۔ جو رسالہ البیان امرتسر کے اکتوبر و نومبر ۱۹۴۲ء کے دو پرچوں میں شائع ہوئی تھی۔ ابوبکر شافعی کا ترجمہ نومبر کے پرچے میں چھپا ہے۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ ان کے متعلق خلاصۃ الاقوال میں علامہ حلی شیعی نے خود یوں لکھا ہے کہ "یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے اور باطن میں شیعہ امامیہ تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے"۔ اور دونوں مذہبوں پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال ص۲۔

محمد بن عبداللہ القطان | رافضی معتزلی، ان کو محمد بن عبداللہ بن محمد بن احمد بن ایوب ابوبکر القطان بھی کہتے ہیں۔ مگر عموماً باپ کا نام چھوڑ کر دادا کے نام کے ساتھ منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور محمد بن عبداللہ القطان لوگ لکھتے ہیں۔ ابن حجر لسان المیزان جلد ۵ ص ۲۲۹ میں ان کے متعلق "رافضی معتزلی" لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن جریر سے ان کا حدیثیں سننا تو صحیح ہے الا انہ کان رافضیاً۔ کان سیئ المذہب واحسب انہ کان یکذب

تفضیل علیؓ مات ۳۹۸ھ مگر یہ رافضی تھے۔ بد مذہب تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علیؓ کو فضیلت دینے کے لئے جھوٹ کا استعمال کرتے تھے

ابراہیم بن حبیب | لسان المیزان میں ابن حجر نے ان کا مختصر سا ذکر کیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ طوسی نے ان کا ذکر رجال شیعہ میں کیا ہے، جس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ یہ شیعہ تھے۔

علی بن عبداللہ بن وصیف الناشی | ابوالحسن الحلاء۔ ان کا ذکر بھی لسان المیزان میں ہے۔ اقراری شیعہ تھے ادب و لغت کے ماہر تھے اور تشیع میں غلو رکھتے تھے، ۳۶۵ھ میں نوے برس سے زیادہ عمر پا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

محمد اسحٰق بن مہران ابوبکر المقری شاموخ | یہ بڑے قاری بھی تھے۔ ان سے قرأت کی روایتیں بھی مشہور تھے۔ ابن جریر کی من گھڑت قرأتوں کی یہ روایت کرتے تھے مگر ابن جریر کے نام سے نہیں کیونکہ ابن جریر کی قرأتیں قرأت کے بازار میں چالو نہ تھیں، جھوٹی حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے، خصوصاً حضرت علیؓ اور ان کے اہل بیت کے مناقب میں ۳۵۲ھ میں وفات پائی، تشیع میں کافی غلو رکھتے تھے۔

محمد بن المظفر | مشہور محدث تھے ابوالولید الباجی کا بیان ہے کہ ان میں تشیع نمایاں تھا۔ ۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۷۷ھ میں وفات پائی۔ ابن جریر کی وفات کے وقت ۲۴ برس کے تھے۔

محض مثال کے طور سے یہ چند نام میں نے لکھ دیئے ہیں اگر کچھ محنت کی جائے تو ابن جریر کے شیعہ تلامذہ کافی تعداد میں مل سکتے ہیں۔

دو نہیں تین | امام ذہبی اور حافظ ابن حجر تو دو ہی عدد "ابو جعفر محمد بن جریر الطبری" مان کر بیکد دش ہو گئے۔ مگر شیعوں کا کام ایک کو دو بنانے سے بھی نہیں نکلا، اس لئے ان کی بعض کتابوں میں "ابو جعفر محمد بن جریر الطبری" روایت کرتے نظر آتے ہیں ابو عبداللہ الحسین الغضائری سے اور غضائری کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی ابو جعفر محمد بن جریر الطبری مفسر متوفی ۳۱۰ھ کی وفات سے ایک سو ایک یا ایک سو چار برس کے بعد۔ اس لئے مفسر ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تو یہ ہو نہیں سکتے۔ جو ابن یزید تھے۔ اور ابن رستم بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ابن یزید اور ابن رستم ان دونوں میں تو صرف "یزید" اور "رستم" کا فرق ہے۔ اور باقی جتنی باتیں ہو سکتی ہیں سب میں اور یکسانیت کے یہ دونوں فرزند ارجمند توام تھے۔ دونوں کے نام ایک، دونوں کے باپ کے نام ایک دونوں کی کنیت ایک دونوں کا ملک ایک (یعنی طبرستان) دونوں کا مولد یعنی جائے پیدائش ایک یعنی شہر آمل "مولد" اسم ظرف ہے۔ اس لئے ظرف مکان ہی میں دونوں متحد نہ تھے۔ بلکہ ظرف زمان میں بھی دونوں متحد تھے، یعنی دونوں کی پیدائش کا سنہ ۲۲۴ھ ایک اور مہینہ دن، تاریخ اور وقت بھی ایک ہی تھا۔ اور پھر دونوں کی وفات بھی بالکل ساتھ ساتھ ایک ہی وقت ایک ہی دن ایک ہی مہینے اور ایک ہی سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی اور پھر دونوں شاید ایک ہی قبر میں ساتھ ساتھ مدفون بھی ہوئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی نہ کوئی سنی یا شیعہ ماہر فن رجال و تاریخ یہ ضرور لکھتا کہ ابن یزید ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ابن رستم فلاں سنہ میں پیدا ہوئے۔ ابن یزید ۳۱۰ھ میں مرے تھے اور ابن رستم فلاں سنہ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ابن یزید کی قبر فلاں جگہ ہے اور ابن رستم کی قبر فلاں جگہ، صرف دادا کے نام کو بدل دینے سے ایک شخص ایک سے دو ہو جائے جب تو بڑی آسانی کے ساتھ بہتیرے ایک کو دو کر دیا جا سکتا ہے۔

غرض یزید اور رستم کا فرق تو نکالا تھا شیعوں ہی نے جس کو علمائے اہل سنت نے بھی قبول کر لیا مگر دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اگلے وضاعین و کذابین سے ایسی غلطیاں بہت ہوئی ہیں کہ کسی راوی کا سال ولادت یا سال وفات معلوم نہ ہو سکنے کی وجہ سے قیاس سے کام لیا، اور وہ قیاس غلط نکلا۔ بعد والوں نے جب فن رجال کی تدوین شروع کی اور راویوں کے سال ولادت و وفات کا پتہ لگا لگا کر قلمبند کرنا شروع کیا۔ تو جہاں خود ان ائمہ رجال کو اپنے شیوخ کی بعض کمزوریاں محسوس ہوئیں وہاں کسی کا سال ولادت حذف کر دیا۔ کسی کا سال وفات تک کھا بیٹھے جس طرح عبید بن سباق کا سال ولادت و وفات اگر ائمہ رجال لکھ دیتے تو حضرت زید بن ثابت سے ان کی روایت حدیث جمع قرآن کیونکر صحیح ثابت ہو سکتی تھی، اس لئے نہ ان کا سال ولادت کسی نے لکھا۔ نہ سال وفات نہ عمر۔ باوجود اس کے کہ خود امام بخاری نے اپنی تاریخ میں سب کچھ لکھ دیا تھا

لیکن بعد والوں نے اپنی کتابوں میں اس کو نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خود امام بخاری نے کیوں لکھدیا تھا؟ وہ اس لئے کہ ان کے دل میں چور نہ تھا اور نہ انھوں نے وہ جمع قرآن والی روایت اپنی کتاب میں درج کی تھی۔ یہ تو پورا "بَابُ جمع القرآن" ہی صحیح بخاری میں الحاق ہے۔ جس کو میں نے اپنی کتاب "جمع القرآن" میں زبردست دلائل سے ثابت کیا ہے اور اگر اس باب کے الحاق ہونے سے انکار کیا جائے گا تو پھر سارا الزام خود امام بخاری ہی پر عائد ہو کر رہے گا۔ بس اتنا کہنا صحیح ہوگا کہ امام بخاری نے روایت کو صحیح سمجھ کر ابن شہاب زہری کے اعتماد پر اپنی کتاب میں اس کو درج کر لیا۔ پھر بھی کم سے کم ان کی بصیرت فی الحدیث پر حرف ضرور آئے گا۔ اور میرا دل اس کو قبول نہیں کرتا کہ میں ان کو کم بصیرت سمجھوں اور جہاں ائمہ رجال نے سال ولادت و وفات کو ہڑپ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی وہاں کتنے وضاعین و کذابین کا راز فاش ہو کر رہا۔ چاہے اگلوں میں سے کسی نے اس راز کو فاش کر دیا۔ چاہے قدرت نے کسی کے متعلق اس حقیر تنا عمادی کو منتخب کر رکھا تھا۔

اور شیعوں کے یہاں تو حدیثوں کی جمع تدوین ہی دیر کر کے شروع ہوئی۔ رجال شیعہ پر اور بھی بہت دیر کر کے کتابیں لکھی گئیں۔ ابو عبداللہ الغضائری (یعنی حسین بن الحسن بن محمد بن مقتسم بن محمد بن یحیٰ بن جلیس بن عبداللہ المخزومی الغضائری) جو بغدادی تھے۔ جن کا سال وفات شیعوں کی کتاب تنقیح المقال فی اسماء الرجال میں ۴۱۱ھ لکھا ہے۔ مگر انساب سمعانی میں ۴۱۳ھ ہے۔ اس سے روایت گھڑنے والے صاحب واقف نہ تھے؛ اس لئے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو ان کا شاگرد لکھ کر طبری کی طرف سے ایک روایت لکھدی کہ میں نے اپنے شیخ غضائری کے ہاتھ کا لکھا ہوا یوں دیکھا ہے۔ غضائری غریب تو ابو جعفر بن جریر طبری کی وفات سے ایک سو ایک یا ایک سو چار برس کے بعد دنیا میں قدم رکھا تھا۔ تو اب یہ روایت کس طرح درست قرار دی جائے؟ مگر اس دشواری کو دور کرنے میں کوئی دشواری تو تھی نہیں۔ جن لوگوں کو ایک ایک دو دو گرنا آتا ہے۔ ان کو پھر دو سے تین بنا دینا کیا دشوار ہے۔ فوراً ایک اور ابو جعفر بن جریر الطبری تیسرے بھی بنا لئے گئے۔ دوسرے ابن جریر کی تصنیف کے وقت ان کے دادا کا نام یزید ایک ایسا نام تھا جس کا سننا بھی گوارا نہ تھا۔ اس لئے بدل دینا یوں بھی ضروری تھا اور پھر اصلی و جعلی میں کچھ تفریق دکھلانے کے لئے تو ضروری تھی۔ اس لئے دادا کے نام کو یزید سے رستم بنا دیا گیا تھا۔ مگر اب تو دوسرے کے بعد تیسرے کی تصنیف میں کسی رد و بدل کی ضرورت ہی نہ تھی دونوں تو جعلی ہی ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ دونوں میں کچھ تفریق کیوں پیدا کی جائے۔ اس لئے دوسرے اور تیسرے میں کسی قسم کا بھی فرق نہیں رکھا گیا۔ دونوں کا نام محمد، دونوں کی کنیت ابو جعفر، دونوں کے باپ کا نام جریر، دونوں کے دادا کا نام رستم، دونوں طبرستان کے رہنے والے، دونوں کا مولد آمل، اور دونوں ہی نے امامۃ پر ایک کتاب لکھی تھی، اور دونوں نے اپنی کتاب کا نام کتابُ المسترشد ہی رکھا تھا۔ اور پھر دونوں کا سال ولادت و وفات کو نامعلوم ہی رکھنے میں دروغ بافی پر پردہ رہ بھی سکتا تھا۔ غرض تین ابن جریر تھے ایک تو عامی یعنی ایک اہل سنت تھے جو مفسر تھے جو ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری متوفی سنہ ۳۱۰ھ تھے، اور دوسرے ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری جو ابن یزید کے معاصر تھے، اور پھر تیسرے بھی ابو جعفر بن جریر بن رستم الطبری ہی تھے، جو شیعوں کے شیخ الحدیث محمد بن الحسن الطوسی مصنف تہذیب و استبصار (کتب حدیث شیعہ) متوفی سنہ ۴۶۰ھ کے ہمعصر تھے۔ جیسا کہ تنقیح المقال میں ماماقانی نے لکھا ہے، ان تینوں میں سے صرف پہلے مفسر اور مؤرخ مشہور تھے اور سنی تھے اور باقی دونوں خاص شیعہ امامیہ تھے۔ اور اہل سنت ائمہ رجال کے نزدیک تو دو ہی ابن جریر تھے، پہلے جو مفسر و مؤرخ تھے، وہ ہلکے پھلکے شیعہ تھے اور دوسرے جو ان کے بالکل ہمعصر تھے۔ وہ کٹر تھے، تیسرے سے تو اہل سنت علماء غالباً آج سے پہلے واقف بھی نہ ہوں گے۔ بلکہ اگلے شیعے ائمہ رجال بھی تیسرے ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری سے واقف نہ تھے، اسی طرح شیخ طوسی و علامہ نجاشی و علامہ حلی و شیخ تفرشی بہاء الدین عاملی وغیرہم نے ان تیسرے ابن جریر الطبری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ پہلے پہل ان سے دنیا کو روشناس کیا ہے علامہ شیخ عبداللہ الماماقانی مدظلہ صاحب تنقیح المقال نے جو سنہ ۱۳۵۰ھ تک تو زندہ تھے، بعد کا حال معلوم نہیں، اسی لئے وہ خود ان تیسرے ابن جریر کے ترجمے میں لکھتے ہیں لیس لہ ذکر فی کتب اصحابنا الرجالیین یعنی ہمارے ماہرین علم رجال کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر چونکہ ان کو ابو عبداللہ حسین بن حسن الغضائری متوفی سنہ ۴۱۱ھ (و بقول انساب السمعانی سنہ ۴۱۳ھ) کا شاگرد سید ہاشم البحرانی نے اپنی کتاب مدینۃ المعاجز میں لکھ دیا ہے۔ اب اس کو نباہنا ضروری ہے (ورنہ اماموں کے معجزے جو گھڑ گھڑ کر سلسلۂ اسناد روایت جوڑ جوڑ کر غریب سید ہاشم البحرانی اپنے عالم بحران میں بمشکل اکٹھا کئے ہیں اور ان کے ذریعے امامت کی کھوکھلی دیوار پر پشتہ لگایا ہے، وہ سب کے سب رائیگان چلے جائیں گے بحرانی مذکور نے اس کتاب میں اماموں کے معجزے روایتوں کے ذریعہ بیان کئے ہیں۔ جو سب عجیب و غریب ہیں، یہاں ساتویں معجزے کی تفصیل تو مذکور نہیں، صرف پتھر سے شہد نکلنے کا ذکر کیا ہے۔ اور بتیسواں (۳۲) معجزہ حضرت حسن بن علی کا بیان کیا ہے کہ وہ بھیڑیئے سے کچھ بولے تو بھیڑیئے نے ان سے باتیں کیں) اس کتاب میں بہت سی روایتیں ابن جریر الطبری کی کتاب المسترشد فی الامامۃ سے بھی منقول ہے۔ ایک جگہ کتاب المسترشد ہی سے یوں نقل کیا ہے "قال ابوجعفر بن جریر الطبری" اس کتاب المسترشد کے مصنف تو خود ابو جعفر بن جریر الطبری ہی ہیں۔ وہ کیوں لکھنے لگے کہ "ابو جعفر بن جریر الطبری نے کہا"؟ بس اس سے معلوم ہو گیا کہ دو ابن جریر بن رستم الطبری ہیں۔ وہ ابن جریر بن یزید تو عامی تھے کوئی خاصی یعنی شیعہ ان سے کیوں روایت کرنے لگا؟ اس لئے یہ تو لکھ نہیں سکتے تھے کہ ابن رستم نے ابن یزید سے روایت کی ہے، حالانکہ اگر واقعی کوئی ابن جریر بن رستم بھی تھے، تو وہ ابن جریر بن یزید کے ہمعصر تھے، اس لئے ایک دوسرے سے روایت کر سکتے تھے مگر جب غضائری صاحب ان دونوں ہمعصروں کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے تو غضائری کے شاگرد تیسرے ابن جریر الطبری جو یقیناً پانچویں صدی کے آدمی ہوں گے یا چوتھی صدی کے آواخر کے وہ کس طرح سو سوا سو برس قبل کے آدمی سے روایت کر سکتے ہیں؟ بالفرض ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری الاملی دو تھے۔ مگر جب دونوں کے درمیان سوا سو برس ڈیڑھ سو برس کا فاصلہ ہو تو پھر دونوں کے درمیان سلسلۂ روایت بلا واسطہ کیونکر صحیح مانا جا سکتا ہے۔

غضائری سے ابو جعفر بن جریر الطبری کی جو روایت بنائی گئی تھی، صرف اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دو ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری بنائے گئے تھے۔ تاکہ جس کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۳ھ میں ہو اس سے اس ابو جعفر بن جریر الطبری کی روایت صحیح ہو سکے۔ مگر پھر جو ان دونوں ابن جریروں کے درمیان سلسلہ روایت بیان کر دیا گیا۔ تو وہی دشواری بلکہ اس سے بھی سخت دشواری باقی رہ گئی۔ وہ اس طرح کہ سابق ابن جریر بن رستم ہمعصر ہیں ابن جریر بن یزید متوفی ۳۱۰ھ کے اور ہمعصری بظاہر مقتضی ہے ہم سنی کے، امید یہی کی جاتی ہے کہ دوسرے ہمعصر کی بھی وفات دو چار برس پہلے یا بعد کو ہوئی ہوگی۔

اور غضائری کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۳ھ میں ہے۔ تو ان کے شاگرد کو بظاہر قیاس ان سے چھوٹا ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے تیسرے ابو جعفر محمد ابن جریر بن رستم الطبری جو غضائری کے شاگرد تھے بظاہر قیاس غضائری کے دس پانچ برس بعد ہی مرے ہوں گے۔ تو پھر جب غضائری کی روایت سابق ابن جریر سے متعذر ہو تو غضائری کے ایک شاگرد کی روایت سابق ابن جریر سے کس طرح ممکن ہوگی فَرَّمن المطر و قَرَّ فی المیزاب جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو اور ان کو صحیح ثابت کرنے والوں کو اس قسم کی دشواریوں کا سامنا اکثر کرنا پڑتا ہے، غرض دونوں ابن جریر ابن رستم بتقاضائے مصلحت تصنیف کر لئے گئے تھے۔ ایک کو اگلوں نے تصنیف کیا تھا۔ اور دوسرے کو صاحب تنقیح المقال علامہ شیخ عبداللہ الماماقانی نے جو ۱۳۵۰ھ تک یعنی آج سے چوبیس سال قبل تک تو ضرور زندہ تھے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس وقت بھی زندہ ہوں گے۔ خدا کرے کہ زندہ ہوں۔ اور میری یہ تنقید ان کی نظر سے گذر جائے۔

انسانی معاشی مسئلہ
عقل کی رُو سے نہیں
وحی کی مدد سے طے ہو سکتا ہے
عقل نے کیا سوچا؟ —— وحی نے کیا دیا؟
یہ آپ کو **نظامِ ربوبیت** میں ملے گا ۔۔!!

بابُ المراسلات

طاہرہ بیٹی کا خط

یہ قرآنی تعلیم کی جاذبیت کا حیرت انگیز اثر ہے کہ تھوڑے سے عرصہ میں ملک میں ہزاروں "سلیم" اور سینکڑوں "طاہرہ بیٹیاں" پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ان کا سلسلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ ان کے تاثرات کیا ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیے۔ جو کیمبلپور کی ایک "طاہرہ بیٹی" نے اپنے "قرآنی چچا جان" (پرویز صاحب) کو لکھا ہے۔

آپ کا خط ملا۔ نظام کی عدم موجودگی سے معاشرہ میں جو ناہمواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ انھیں سامنے لاؤں۔ کافی دن اسی تجویز پر غور کرتی رہی ہوں۔

چچا جان! اگر گرد و پیش پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو سوائے تلخیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ روزانہ اخباروں میں قومی اخلاق کا مظاہرہ کچھ اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ ایک حساس دل ان کاغذوں پر نظر ہی نہیں ڈال سکتا۔ میں نے تو عرصہ تین سال ہوا کوئی اخبار۔ کوئی رسالہ حتیٰ کہ قرآن اور طلوع اسلام کے علاوہ دوسری کوئی کتاب دیکھی تک نہیں۔ اپنی قوم کی گری ہوئی حالت کو دیکھنا کس طرح برداشت کروں۔ میں مایوس نہیں ہوں خزاں کے بعد بہار ضرور آتی ہے۔ امید کی ایک جھلملاتی ہوئی کرن اس تڑپ کو تیز اور حوصلہ کو بلند سے بلند تر کرتی ہے۔

دراصل یہ رونا مجھ سے رویا نہیں جاتا۔ میں نے تو یہ شعار زندگی بنا لیا ہے کہ

حق کی جستجو میں رہوں گی۔ نیکی کروں گی۔ قرآنی مفہوم کو اپنے اندر جذب کر کے قرآنی زندگی بسر کروں گی۔ بس

موجودہ تلخیوں کا واحد علاج قرآنی معاشرہ کا قیام ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ قرآنی نظریہ کو عام کر دیں۔ اسی سلسلہ میں "قرآنی معاشرے کا معاشی نظام" کے عنوان سے قرآنی فہم کے مطابق ایک مضمون لکھا ہے۔ اب چاہتی ہوں کہ اسے ایک دو عام اخباروں میں بھجوا دوں۔ تاکہ شائع ہو جائے۔

سمندر میں کنکریوں کے پھینکنے سے پانی میں ہلچل تو مچ جاتی ہے نا۔ شاید اس جمود کو کوئی توڑ دے۔

ہمارا کام ہے فرض کو پورا کرنا۔ آگے خدا کی مرضی۔

ایک خیال مجھے چند دنوں سے پریشان کئے ہوئے ہے جو لوگ حق کا مطالعہ کرتے ہیں بجائے اس کے کہ ایک لڑی میں منسلک ہوتے جائیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد کھڑی کر لیتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

ان کا مقصد حق کی تلاش ہوتا ہے۔ یا اپنی شخصیت کو شہرت دینا۔

آپ کی بیٹی

پرویز — عزیز بیٹی! ہمارے معاشرہ میں جو ناہمواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ انھیں سامنے لانا محض "رونا" نہیں ہے۔ ہمارے ہاں مصیبت یہ ہو رہی ہے کہ مریض تپ دق کی آخری منزل میں پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتا یہی ہے کہ وہ بالکل تندرست و توانا ہے۔ لہٰذا اس کے علاج کے لئے ضروری ہے کہ اسے بتایا جائے دکھایا جائے کہ وہ تندرست نہیں، بیمار ہے۔ جب تک اسے یہ محسوس اور معلوم نہیں ہو گا کہ وہ بیمار ہے۔ اور اس قدر شدید بیمار۔ وہ اپنے علاج کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو گا۔ اپنی معاشرتی ناہمواریوں کو سامنے لانا۔ مریض کو اس کے مریض ہونے سے آگاہ کرنا ہے اس کے بعد اسے اس کا علاج بتانا چاہیئے۔

باقی رہا تمہارا دوسرا سوال۔ سو متلاشیانِ حق میں سے ایک طبقہ تو ایسا ہوتا ہے۔ جن کا مقصد (شعوری یا غیر شعوری طور پر) محض اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ انھیں متلاشیانِ حق کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ جو لوگ درحقیقت متلاشیانِ حق ہوتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ رہ سکتے ہیں۔ جب تک حق ان کے سامنے بے نقاب نہ ہو جائے۔ حق کے منکشف ہو جانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف تو ایک طرف، ایک دوسرے سے الگ بھی رہ سکیں۔ حق قرآن کے اندر ہے اور جو لوگ اس حق کو پا لیتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی اپنی "مسجدیں" الگ الگ نہیں بناتے۔ ان کی تو ملکہ کیفیت وہ ہو جاتی ہے، جسے غالبؔ نے اپنے خاص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ذوقیست ہمدمے بہ فغاں جگر زدم ز رشک
خار رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ ماند

لیکن اختلافات مٹانے اور ایک کو دوسرے سے قریب تر کرنے کا حقیقی ذریعہ قرآنی نظام ہے۔ نہ کہ قرآن کا انفرادی طور پر سمجھنا۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے تو پھر الف بین قلوبکم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نظام اور مرکز کے بغیر یہ نماز، صلوٰۃ بے امام کا نقشہ لئے ہوتی ہے۔ جس میں ایک کھڑا ہوتا ہے۔ ایک بیٹھا، ایک رکوع میں ہوتا ہے ایک سجدے میں۔ امام ان سب میں ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا کرتا ہے۔

فطرانہ

دسالپور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ فطرانہ سے متعلق قرآنی احکام سے مطلع کیا جائے

جواب — فطرانہ کے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ روایات میں اس کا حکم ملتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ نے اس کی بابت حکم دیا تھا تو وہ حکم اس دور سے متعلق ہو گا۔ جب قرآنی معاشرہ اپنی ابتدائی منازل میں ہو گا۔ اس وقت انفرادی خیرات ضروری تھی۔ تاکہ غریبوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ لیکن جب حضور کے آخر میں مستکمل فرمودہ قرآنی نظام عمل میں آ گیا۔ اور حکومت یعنی ذرائع پیداوار و اشیاء کا نظم و نسق ملت کے اجتماعی ہاتھوں میں آ گیا۔ تو اس کے بعد انفرادی خیرات کی ضرورت کہاں رہ سکتی تھی۔ اس وقت ہمارے ہاں فطرانہ چھوڑ زکوٰۃ تک بھی خیرات میں داخل ہے اور جب تک قرآن کا نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کو باقی رکھنا چاہیئے۔ تاکہ ان کے ذریعہ کوئی خیراتی کام چل سکیں لیکن اس وقت بھی اس کی ضرورت ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ رقوم بھک منگوں کی جھولی میں جا پڑیں۔ ان کی جمع و تحصیل اور پھر مناسب مقامات پر خرچ کا انتظام اجتماعی طور پر کیا جائے۔

حقائق و عبر

ایک اور دلیل

محترم عبدالماجد صاحب دریابادی نے وزیر اعظم (محمد علی صاحب) کے عقد ثانی کے متعلق اپنے اخبار صدق کی ۹؍اپریل کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ تحریر فرمایا ہے۔

"پاکستان کی خبر ہے کہ وزیر اعظم محمد علی صاحب نے اپنی پہلی زوجہ محترمہ کی موجودگی میں دوسرا عقد ایک عرب خاتون سے کر لیا، جو اب تک ان کی سکریٹری تھیں۔ خبر کا شائع ہونا تھا کہ جیسے ایک آگ لگ گئی۔ اور ہر طرف سے ملامت و احتجاج کی بھرمار ہونے لگی۔ درحقیقت وزیر محترم قابل مبارکباد ہیں کہ ایسے ملک میں جہاں عقد ثانی ایک "جرم" بنتا جا رہا ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ "روشن خیالی" یا تقلید فرنگ نے عقد ثانی کو ایک معصیت کے درجہ میں رکھ دیا ہے، اپنے اس شرعی حق کا استعمال کر کے ایک نمایاں ثبوت اپنی اخلاقی جرأت و ہمت کا دیا۔ اللہ ایسا کرے کہ انھیں پہلی زوجہ محترمہ کے ساتھ بھی پورے حسن سلوک کی توفیق نصیب رہے۔ تاکہ تعدد ازدواج بدنام نہ ہونے پائے اور ان کی روشن مثال سے دوسروں کی ہمت افزائی ہو

اعتراضات اب تک جتنے شائع ہوئے ہیں، سب بے وزن بلکہ مہمل ہیں۔ اکثر صورتوں میں تو محض تہذیب فرنگ سے مرعوبیت کے غماز ہیں۔ اور بعض صورتوں میں تو کہا جائے کہ اس سے بھی پست تر ذہنیت کی جھلکیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ حالی نے سرسید کے ایک معاند کی ذہنیت کی ترجمہ و تحلیل خود اس کی زبان سے یوں کی ہے ؎

رنج اس کا کچھ نہیں مجھکو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

تو حسد و رشک بھی کبھی کبھی اپنے کو نکتہ چینی کے لباس میں چھپاتا ہے۔ اور انسان جس نعمت کا حصول اپنے لئے دشوار یا ممتنع پاتا ہے۔ دوسرے سے اس نعمت کے سلب یا زوال کی تمنا کرنے لگتا۔ اور اسے برا بھلا ہی کہہ کر اپنا دل خوش کرنے لگتا ہے۔"

(اگلا صفحہ دیکھئے)

محترم دریابادی صاحب نے چونکہ کالج میں سائیکلوجی پڑھی تھی اس لئے انہوں نے تعددِ ازدواج کے مخالفین کا نفسیاتی تجزیہ فرماکر ان کے جذبۂ محرکہ کی ٹوہ لگائی ہے۔ لیکن ایک سائیکلوجی کا طالب علم یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ دریابادی صاحب کی طرف سے عقدِ ثانی کی جو اس شدت سے تائید ہو رہی ہے۔ کہیں اس کا جذبۂ محرکہ یہی تو نہیں کہ انہوں نے جو ایک عرصہ پہلے خود عقدِ ثانی فرمایا تھا ان کا "مجرم ضمیر" (جسے سائیکلوجی کی اصطلاح میں لکھتے ہیں) غیر شعوری طور پر اس کے جواز کی سند ڈھونڈھ کر اپنے آپ کو اطمینان دلانا چاہتا ہے؟

ہم محترم دریابادی صاحب کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اس طنز و طعن سے الگ مسلمانوں کے یہاں ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ وہ کبھی قرآن سے بھی تو پوچھ لیا کریں کہ فلاں معاملہ (مثلاً تعددِ ازدواج) کے متعلق اس کا کیا حکم ہے؟ خدا کرے کہ عمر کے اس آخری حصے میں ہی انہیں اس کی توفیق مل جائے کہ وہ دین سے متعلق امور کے لئے قرآن کی طرف رجوع فرمالیا کریں اس قرآن کی طرف جسے حضور نبی اکرمؐ نے خدا سے پاکر امت کو دیا تھا۔ نہ کہ اس قرآن کی طرف جسے طبری اور رازی نے پیش کیا تھا اور جس کی تفسیر ابھی خود دریابادی صاحب نے لکھی ہے، جس میں "قرآن کے علاوہ اور سب کچھ ہے"۔

اللہ کی قدرتِ کاملہ

"لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو جب یہ منظور ہوا کہ ڈاسب جیل سے باہر آجائے۔ تو قانون کی دنیا میں زلزلہ آگیا۔ بڑے بڑے سر بفلک "محلات" زمین بوس ہوگئے "پہاڑ" ریزہ ریزہ ہوگئے۔ "بستیاں" تہہ و بالا ہوگئیں۔ اور قید خانے کا پھاٹک یکایک کھل گیا۔ اور اس میں وہ داعیٔ حق ــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی ــــ نکل کر باہر آگیا"۔ (ایشیا لاہور بابت ۹ مئی ۱۹۵۵ء)

آپ نے غور فرمایا کہ جماعتِ اسلامی کے نقطۂ نگاہ سے، اللہ میاں نے ان کے امیر کے سلسلے میں کیا "تقسیمِ عمل" فرما رکھی ہے؟ یعنی مودودی صاحب کو جیل میں تو بھجواتے ہیں طاغوتی حکومت کے نمائندے۔ اس لئے وہ ہر قسم کی لعن طعن کے مستحق ہوتے ہیں۔ لیکن دو تین سال کے بعد انہیں جیل سے نکالتے ہیں خود اللہ میاں۔ جیل میں بھجوانے میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ اس کی مشیت، مرضی، قدرت، کے خلاف ہوتا ہے لیکن جیل سے باہر آنا اللہ کی مشیت، مرضی، قدرت کے مطابق ہوتا ہے دنیا کا تو علم نہیں لیکن اسلام کی تاریخ میں اس قسم کی جہالت کی مثال شاید ہی کہیں اور ملتی ہو۔

محض دین سے نہیں

اس سلسلہ میں اخبار "ایشیا" مودودی صاحب کے استقبال کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے

اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوم کو اس کی تمام کمزوریوں کوتاہیوں اور خامکاریوں کے باوجود خدا کے دین سے محبت ہے۔ محض دین سے نہیں بلکہ اس تصورِ دین

۲ سے محبت ہے، جو مولانا مودودی صاحب نے ان کے سامنے پیش کیا۔

یہ ہے جماعت اسلامی کی صحیح تصویر۔ یعنی ان کے نزدیک محض خدا کا دین محبت کے قابل نہیں۔ محبت کے قابل وہ تصورِ دین ہے جسے مودودی صاحب پیش فرماتے ہیں۔ اور جو شخص ان کے پیش کردہ تصورِ دین سے محبت نہیں کرتا۔ وہ دین سے خارج ہے۔

یہ ہے وہ شخصیت پرستی جس کے سیلاب میں عقل اور دین دونوں بہہ جاتے ہیں۔

بزمِ طلوعِ اسلام

جوں جوں تحریکِ طلوعِ اسلام کا چرچا عام ہوتا جاتا ہے مخالفین تحریک اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کرتے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے فرمان "عدو ہم یار است" کے مصداق ہم ان حضرات کے مشکور ہیں کہ وہ جہاں طلوعِ اسلام نہیں پہونچتا وہاں بھی اس کا پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ یہ حضرات نجی گفتگو میں۔ کھلی محفلوں میں، مسجدوں میں پبلک جلسوں میں اخبارات میں غرضیکہ ہر جگہ صبح و شام طلوعِ اسلام کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ ہر چند یہ ذکر غالب کے الفاظ میں "کس کس برائی سے" ہوتا ہے۔ لیکن

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اس مخالفت کا یہ اثر ہوا ہے کہ جن طالبانِ حق کے کانوں میں طلوعِ اسلام کی بھنک پڑجاتی ہے۔ وہ اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے اور اسے سمجھنے کے خواہشمند ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے حضرات کے دلوں میں اکثر وساوس بھر دیئے جاتے ہیں اس لئے بزم ہائے طلوعِ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کو رفع کرنے کے لئے تیار رہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ ذاتی طور پر ایسے حضرات سے مل کر بھی ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کریں۔ اور مقامی اور علاقائی اخبارات میں مناسب مضامین شائع کرا کے بھی علاقے بھر کو طلوعِ اسلام کی دعوت سے متعارف کرائیں۔ ہمارے بعض قارئین مخالفانہ مضامین کے تراشے ہماری طرف بھیج دیتے ہیں اور اس کے متمنی ہوتے ہیں کہ ہم فرداً فرداً ہر ایک کا جواب دیں۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کے لئے یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ ہم اپنے قارئین اور بزموں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ مخالفانہ مضامین کے جوابات از خود دیدیا کریں۔ طلوعِ اسلام نے اپنا مفہوم و مقصد بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی ابہام نہیں چھوڑا ہے۔ تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ اندریں حالات قارئین کے لئے اس کی روشنی میں مدافعانہ مضامین لکھنا چنداں مشکل نہیں ہونا چاہیئے۔ بزموں کو خصوصیت سے اِدھر توجہ دینی چاہیئے۔

راولپنڈی مقامِ مسرت ہے کہ کئی بزموں نے مقامی حالات کے مطابق مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے راولپنڈی کی بزم نے دارالمطالعہ قائم کر رکھا ہے۔ اس میں مطالعہ ہی کا انتظام نہیں بلکہ شکوک و اعتراضات کے بھی جوابات دیئے جاتے ہیں۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہو رہا ہے۔

بزم ہفتہ وار اجتماع بھی منعقد کرتی ہے۔ یہ اجتماع ہر جمعہ کو شام کے ۵ بجے سے ۷ بجے تک شیخ عبداللطیف صاحب (مکان عزیز منزل واقع براڈن لو اسٹریٹ صدر) میں ہوتا ہے۔ اجتماع میں معارف القرآن جلد سوم کا درس ہوتا ہے۔ اور طلوعِ اسلام کے منتخب مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ پھر تبادلۂ خیال ہوتا ہے اور ہر رکن ہر ہفتے بھر کے تجربات بھی بیان کرتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں لائحہ کار میں اصلاح و ترمیم کی جاتی ہے۔

بزم نوجوانوں کی ضروریات و مشکلات پر خصوصی توجہ دے رہی ہے اور انہیں قرآنی فکر سے متعارف کرانے میں منہمک ہے اس کے زیرِ غور ایک امدادی اسکیم ہے۔ جس کی رو سے ضرورتمند ارکان بزم کی مناسب مدد کی جا سکے گی۔

ڈھاکہ محمد صابر علی صاحب ۵۰ کپتان بازار، ڈاک خانہ واری ڈھاکہ اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی بزم عرصہ دو سال سے مصروفِ عمل ہے۔ ہر دوسرے جمعہ کو اس کا اجتماع قائدِ اعظم کالج میں منعقد ہوتا ہے، بزم نے ایک لائبریری بھی قائم رکھی ہے جہاں سے کتابیں مطالعہ کے لئے بھی دی جاتی ہیں اور مستحقین کو مفت بھی دیدی جاتی ہیں۔ یہ بزم بھی بحمداللہ سرگرمی سے تبلیغی مقاصد میں مصروف ہے۔ ڈھاکہ اور گرد و نواح میں تحریک کا جو چرچا ہو رہا ہے۔ وہ بہت حد تک اسی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

نقد و نظر

سوچئے اور دولت کمائیے مصنف:۔ نپولین ہل۔ مترجم محمد غوث صدیقی۔

مجلد گرد پوش ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے شائع کردہ نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی

اردو میں عملی نفسیات پر طبع زاد تصانیف کی بڑی کمی ہے اس لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان اور دوسری زبانوں سے اردو ترجمے کئے جائیں۔ تاکہ مناسب مواد مل جائے۔ زیرِ نظر کتاب اسی قبیل کی کوشش ہے۔ یہ نپولین ہل کی تصنیف ہے۔ جسے محمد غوث صدیقی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب کا مقصد (بقول مصنف) ان لوگوں کی مدد کرنا ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ احساسِ ناکامی کو کس طرح احساسِ کامیابی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اور دماغ سے کام لے کر کس طرح دولت کمائی جا سکتی ہے۔ اور کس طرح زندگی کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ کتاب میں جا بجا ایسی مثالیں دی گئی ہیں جن سے کتاب کے قاری کے دل میں جرأت و ہمت کے جذبات پیدا کرنا مقصود ہے۔ مترجم نے بعض ابواب میں پاکستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں اپنی طرف سے کچھ پند و نصائح کا اضافہ کر کے کتاب کو اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ترجمہ جلدی میں کیا گیا ہے۔ اگر ترجمے پر نظرِ ثانی کر لی جاتی تو کتاب اور زیادہ رواں اور شستہ ہو سکتی تھی۔ عملی نفسیات کے موضوع سے

(باقی ص ۔۔ پر)

اندرون ہند

پنڈت نہرو کی کانگریس پارٹی ہندوستان کی وہ جماعت ہے جس کا ہمیشہ یہ دعوٰے رہا ہے کہ وہ ایک فرقہ دار نہیں بلکہ قومی جماعت ہے۔ تقسیم کے بعد کانگریس نے خصوصیت سے یہ دعوٰے باندھا کہ وہ ہندوستان کے سب فرقوں کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے فرقہ پرستی کا قلع قمع کر کے چھوڑے گی۔ لیکن ہندو کی ذہنیت میں نفرت کچھ اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ وہ فرقہ دارانہ تعصب سے بلند جا ہی نہیں سکتا۔ کہنے کو تو اس نے اپنے ہاں سیکولر یعنی غیر مذہبی اور غیر فرقہ دارانہ حکومت بنائی۔ لیکن عملاً وہ ہندو حکومت ہی ہے۔ حکومت تو ایک طرف، خود کانگریس جس کی حکومت ہے بدستور متعصب ہندو جماعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود یکہ مسلمانوں نے کانگریس ہی کو اپنی جماعت سمجھنے کی کوشش کی۔ انھیں اس کے دامن میں کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ چنانچہ اب وہ اس سے بددل ہو کر کٹ رہے ہیں۔ چونکہ فرقہ پرستی کے خلاف جو مہم ہے۔ اس کا نشانہ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ اس لئے ان کے لئے قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم کریں۔

ابھی دنوں علی گڑھ کے ایک اخبار نے مقامی کانگریس کی ہیئت و ترکیب کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ کانگریس کا سلوک مسلمانوں سے کتنا تنگ نظرانہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اپریل میں کانگریس کمیٹی کے جو انتخاب ہوئے۔ اس کے متعلق نئے منتخب شدہ صدر نے اعتراف کیا ہے کہ "مجھے اس بات سے بڑا دکھ پہنچا ہے کہ وارڈوں کے چناؤ میں اس بات کا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو نہ چنا جائے"۔ لہٰذا اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "جب ہم ان وارڈوں کے چناؤ پر نظر ڈالتے ہیں (جہاں مسلم اکثریت ہے) تو ہندو فرقہ پرستی کا ننگا ناچ نظر آتا ہے۔ جو کانگریس کے لئے شرمناک ہے۔ پانچ وارڈوں میں جہاں غیر مسلم اکثریت تھی۔ ایک مسلمان کانگریسی بھی منتخب نہ ہو سکا۔ خصوصاً نائب حسین صاحب کاظمی اور قدیمی کانگریسی نشی خان صاحب کو سازش کے ساتھ شکست دی گئی (اس کے برعکس مسلم اکثریت کے وارڈ نے پانچ میں سے دو ہندوؤں کو چنا۔ اور ایک ہندو بھائی کو تو سارے ووٹ دیئے۔ اور اپنے وارڈ کا صدر بھی متفقہ طور پر ہندو ہی کو چنا۔ یہ سب کچھ اس مرکزی شہر میں ہو رہا ہے جہاں دوسرے ممالک کے سفراء اور وزراء کو بلا کر ہماری حکومت سنہاپنی رواداری اور اقلیت نوازی کے نمونے اکثر و بیشتر دکھاتی رہتی ہے"۔

یہ صورت حال علی گڑھ تک محدود نہیں۔ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا حال یہی ہے۔ چنانچہ وہ ایک عجیب منزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ جداگانہ تنظیم کا رستہ ان کے لئے مسدود ہے۔ وہ آہ بھی کرتے ہیں۔ تو بدنام ہو جاتے ہیں۔ کانگریس کا سلوک دیکھ کر وہ اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ دوسری کوئی ایسی جماعت نہیں جس میں وہ اطمینان سے شریک ہو سکیں۔ یہ صورت نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے نہ ہندوستان کے لئے۔ مسلمانوں جیسی اہم اقلیت نہ ملکی حالات سے بے تعلق رہ سکتی ہے۔ نہ اسے اس حد تک اپاہج بنایا جا سکتا ہے۔ حکومت ہند کی پالیسی ذرا فراخدلانہ ہوتی تو مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں مناسب مقام متعین ہو جاتا۔ اور اس میں دونوں کا بھلا ہوتا۔ یہ وقت ہے کہ مسلمان سوچیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان کے ذمہ دار ارباب سیاست زمانہ کا رنگ دیکھ کر ہمت ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کی تگ و دو مذہب تک محدود ہو گئی ہے۔ یہ حالات کا اضطراری تقاضا ہی سہی۔ لیکن کیا ملکی سیاست سے یوں کنارہ کش رہا جا سکتا ہے۔ مسلمانان ہند کو بہر حال اس کا حل سوچنا ہو گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلم جماعت جس نے اس طرح سوچنا چاہا گونا گوں مصائب کا نشانہ بن گئی ہے لیکن اگر مسلمانوں کے لیڈر ٹھنڈے دل سے ان حالات پر غور کریں۔ اور دوسروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنے آپ پر بھروسہ کریں۔ تو وہ موجودہ جمود و تعطل کا خاتمہ کر کے مسلمانوں میں حرکت و عمل پیدا کر سکتے ہیں۔ اور انھیں بھی دوسرے فرقوں کے دوش بدوش کھڑا کر سکتے ہیں۔

ہندو کی فرقہ پرستی کے اور مظاہر ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستانی آئین کے مطابق اردو ان چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ جو ہندوستان کی زبانیں کہلاتی ہیں۔ پنڈت نہرو نے اکثر اردو کو ہندوستان کی زبان کہا ہے۔ بلکہ ایک موقعہ پر تو انھوں نے کہا تھا کہ اردو پاکستان کی نہیں ہندوستان کی زبان ہے۔ لیکن اس زبان سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ یوپی میں اسے علاقائی زبان بنانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں۔ وہ سب بے نتیجہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یوپی سے بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک درخواست صدر جمہوریہ ہند تک پہنچائی گئی ہے۔ جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ اس درخواست کو ایک سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر صدر جمہوریہ خاموش ہیں۔ اس دوران میں البتہ دہلی میں بھی اردو کو دیس نکالا مل گیا ہے۔ حالانکہ دہلی کے ایک اخبار کے مطابق "۹۹ فی صدی لوگوں کی زبان اردو ہے۔ دہلی میں آئے ہوئے ریفیوجیز بھی اردو ہی سمجھتے ہیں۔ آریہ سماجی اخبارات بھی اردو ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو کی مخالفت کرنے والے اخبارات بھی اردو ہی میں چھپتے ہیں۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اس کے باوجود دہلی کی بلدیہ تک نے یہ حکم صادر کر دیا ہے کہ پرائمری اسکولوں کے بچے اپنی کتابیں ہندی میں لائیں۔ یہ ان اسکولوں کا حال ہے۔ جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ گویا جو بچے اردو پڑھتے رہے ہیں۔ وہ بھی مجبور ہوں گے کہ ہندی کتابیں لائیں۔ درانحالیکہ وہ ہندی نہیں جانتے"۔ اور یہ محض اس لئے کیا جا رہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور بقول مہاتما گاندھی "قرآن کے حروف میں" لکھی جاتی ہے۔

اسی دہلی میں جہاں پنڈت نہرو سیکولرازم اور سوشلزم کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں، کسٹوڈین کے محکمہ سے مزید پانچ سو مسلمانوں کے نام نوٹس جاری کئے جا رہے ہیں۔ کہ وہ ثابت کریں کہ وہ ہندوستان کے شہری ہیں پاکستان کے شہری نہیں ہیں۔ یعنی دہلی میں اپنے ذاتی مکانوں میں رہنے کے باوجود انھیں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ اسی ملک کے شہری ہیں۔ حالانکہ اگر محکمہ کسٹوڈین کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ متعلقہ اشخاص پاکستانی شہری ہیں۔ تو وہ ان سے مطالبہ کریں کہ اسے غلط ثابت کریں ورنہ نتائج بھگتیں۔ یہ تو دہلی کا حال ہے۔ دوسری جگہوں پر جو کچھ ہو رہا ہو گا۔ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندو بھاگ رہے ہیں اور وزیر تک جا جا کر حالات کا بچشم خود مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ نہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں۔ اور نہ پاکستانی وزیر ہی انھیں ادھر متوجہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں کس قدر گھٹن پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امیر فیصل (سعودی عربیہ کے وزیر اعظم) جب پاکستان آنے سے پیشتر ہندوستان گئے۔ تو ہوائی اڈہ پر مسلمان بھی گئے۔ اور انھوں نے مہمان کو دیکھ کر تین دفعہ نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد یہ پہلا پبلک نعرۂ تکبیر ہے (غالباً اس کے لئے پہلے سے اجازت حاصل کی گئی تھی) اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ شہریت کے حقوق تمام فرقوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔ ایک موقعہ پر پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ انھوں نے "فرقہ پرستی" کو ختم کر دیا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کی بات سو فیصدی صحیح ہے۔

نقد و نظر صفحہ ۱۵ سے آگے

دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام قارئین کو بھی اس کتاب میں کچھ نہ کچھ مل جائیگا۔

کتاب کا یہ انداز ہمارے نزدیک کسی صورت مستحسن نہیں کہلا سکتا کہ کسی انسان کی کامیابی کا پیمانہ اس کی دولت ہو۔ چنانچہ علم کو بھی اسی پیمانے میں ماپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس پر اس بے عملی کو ترجیح دی گئی ہے جو بٹن دبا کر ماہرین کو طلب کر سکے اور "بلا محنت اور کوشش" جو چاہے حاصل کر سکے۔ پانچویں باب میں ہنری فورڈ کی مثال سے کچھ اس قسم کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق پوری تفصیل
مقام حدیث
میں دیکھئے
کتاب دو جلدوں میں ہے
قیمت
فی جلد
چار روپے

بین الاقوامی جائزہ (صفحے سے آگے)

بلاک میں بھی مفاہمت پسندی کا مظاہرہ کرے اور اقوامِ مغرب کو وحدتِ جرمنی کا چکمہ دینے میں کامیاب ہو جائے۔ بظاہر اقوامِ مغرب کے اس فریب میں آنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن عمومی فضا کچھ ایسی "امن پسندی" کی سی ہوتی جا رہی ہے کہ مصالحت خواہی کے منافقانہ مظاہروں کو بھی مسترد کرنا دشوار ہو جائے گا۔

اس مفاہمت پسندی کی فضا میں روس اپنے مقاصدِ حقیقی سے غافل نہیں۔ اس نے انہی دنوں وارسا میں آٹھ قومی کانفرنس طلب کی۔ اور اس میں اشتراکی ناٹو کی داغ بیل ڈالی۔ وارسا میں ایک معاہدہ ہوا ہے جو تیس سال تک نافذ العمل رہے گا۔ اس کی رو سے شریک ممالک کی ایک ہی فوجی کمان بنا دی گئی ہے۔ یہ کمان روسی جرنیل مارشل آئون کونیف کے تحت ہوگی۔ اور اس کا صدر مقام ماسکو ہوگا۔ بیرونی حملہ کی صورت میں مشترکہ کارروائی کی جائے گی۔ وارسا کانفرنس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ یہ معاہدات پیرس کی تصدیق کا جواب ہے۔ اس معاہدہ میں دوسری قوموں کی شرکت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس کا اعلان ہوتے ہی چین نے اعلان کیا کہ ساٹھ کروڑ چینی اپنے آپ کو ہر قسم کی مدد کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ روس نے ایک غیر معمولی اور ناقابلِ یقین اقدام کیا ہے۔ یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ایک اعلیٰ روسی وفد بلگریڈ (یوگوسلاویہ) جا رہا ہے۔ اس میں وزیرِ اعظم مارشل بلگانن اور کمیونسٹ پارٹی کے قائد خروشچیف بھی شریک ہونگے۔ روس کے قائدینِ اعلیٰ کا خود بلگریڈ جانا بہت بڑی بازی ہے اور اس نے اقوامِ مغرب کے حلقہ میں بجا طور پر تشویش پیدا کر دی ہے۔ اگر یہ حربہ کامیاب ہو گیا۔ تو یورپ میں غیر جانبداری کا حلقہ قائم ہو چکا ہوگا اور یہی روس کا مقصود ہے۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

سنہ ۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
سنہ ۵۰ء	نومبر (ایک پرچہ)
سنہ ۵۱ء	مارچ تا نومبر
سنہ ۵۲ء	اگست تا نومبر
سنہ ۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
سنہ ۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزم ہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط وحسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت۔ بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق، قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۵ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے سات اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ، سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور، دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت ساڑھے تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول۔ چھ روپے۔ قسم دوم۔ چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶۔ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گردپوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳ ۷۳۔ کراچی

عالمِ اسلامی

عالم اسلامی کی توجہ زیادہ تر افغانستان پر مرکوز ہے۔ ہمارے اس پاگل ہمسائے کے مزاج ابھی درست نہیں ہوئے۔ پاکستان نے ناچار ۱۵ مئی کی تاریخ مقرر کی کہ اگر اس دن تک افغانستان نے معافی نہ مانگی۔ اور تلافی مافات نہ کی۔ تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے سخت اقدام کیا جائے گا۔ ملک میں عام مطالبہ جو تجارتی مراعات یک قلم ختم کر دینے کا تھا۔ افغانستان کا یہ نہایت کمزور پہلو ہے۔ کیونکہ اس کی تجارت بیرونی دنیا سے صرف پاکستان کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ راستہ بند کر دیا جائے تو اس کی ساری تجارت درآمد برآمد معطل ہو کر رہ جائے۔ افغانستان کو اس کا کما حقہٗ احساس ہے لیکن اس کی بے خردی اور عاقبت نا بینی کا یہ عالم ہے کہ اس کے نمائندے نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پاکستان نے ایسا اقدام کیا تو وہ روس کے ذریعہ دنیا سے تجارت کریں گے۔ اس کا مطلب بالفاظ صحیح تر یہ ہے کہ افغانستان جان بوجھ کر خودکشی کرے گا۔ کیونکہ روس کے ذریعہ دنیا سے رابطہ پیدا کرنے کا اور کچھ مطلب نہیں ہو سکتا۔

بہرحال نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ عالم اسلامی میں بالعموم اس خطرے کو محسوس کیا گیا جو پاکستان اور افغانستان جیسے مسلمان ہمسایہ ممالک میں ایسا مناقشہ پیدا ہونے کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا چنانچہ بیک وقت کئی ممالک مثلاً مصر ترکی سعودی عربیہ اور عراق نے مصالحت کی پیشکش کردی۔ سعودی عرب نے تو اپنے نمائندہ شاہزادہ مساعد بن عبدالرحمن (شاہ سعود کے چچا) کو بھیج بھی دیا ہے۔ شاہزادہ موصوف اس وقت کابل میں ہیں۔ اور شاہی خاندان سے ملاقاتوں میں مصروف ہیں۔ عراق نے کابل اور کراچی میں متعین سفیروں کو ہدایات بھیجی ہیں کہ وہ مصالحت کے لئے مناسب اقدامات کریں۔

پاکستان نے مصالحت کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ افغانستان کو ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس طرح نام نہاد پختونستان کو کسی طرح بھی زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ یہ شرط قابل فہم ہے اور چونکہ پختونستان محض ایک ڈھونگ ہے اس لئے مصالحت کرانے والوں نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ مصالحت کے ان اقدامات سے یہ خطرہ ٹل گیا ہے کہ ۱۵ مئی تک افغانستان نے اپنا رویہ نہ بدلا تو سخت اقدام کیا جائے گا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ضرورت اب پیش ہی نہیں آئے گی۔ بدقسمتی سے افغانستان دوسروں کے کھونٹوں پر ناچ رہا ہے۔ اور از رہ بے بصری نہ اپنا مفاد دیکھ رہا ہے اور نہ اپنے ہمسائے پاکستان کا۔

متعدد ممالک اسلامیہ کا مصالحت کے لئے آمادہ ہو جانا عالم اسلامی کے لئے نیک فال ہے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں عالم اسلامی کے تحت لکھا تھا کہ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو۔ اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے۔ تو اس کے خلاف جنگ کرو (۴۹/۹)۔ مقام مسرت ہے کہ اس فیصلے کی شق اول پر عمل ہو گیا ہے۔ یہی عمل دوسری شق پر عمل کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالم اسلامی میں کسی مناقشہ پر اس مستعدی سے صلح کی کوششیں شروع کر دی گئی ہوں۔ یہ مستعدی مسلمانان عالم کے روشن مستقبل کی واضح علامت ہے۔ اب جب صلح کرانے والے حالات کو بچشم خود دیکھیں گے تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ کاش مسلمان اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنا ایک مشترکہ ادارہ قائم کرلیں جو انہیں ایک مرکز پر جمع کر دے۔ افغانستان جیسے بیوقوفوں کے گمراہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ممالک اسلامی کی کوئی ایسی تنظیم موجود نہیں۔ جو انہیں غلط راہ پر جانے سے روک سکے۔

افغانستان کے قضیے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مشرق وسطی کی دفاعی تنظیم کو اور زیادہ سرگرمی سے قابل عمل بنانا چاہیئے۔ جتنی جلدی ایسی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں گی۔ فتنوں کی سرکوبی بھی اتنی جلدی ہو گی۔ ترکوں کو خصوصیت سے اس کا احساس ہے۔ چنانچہ ناٹو کونسل کے اجلاس پیرس کے سلسلہ میں ترکی کے نائب وزیر اعظم برطانیہ کے وزیر خارجہ سے ملے اور صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی مساعی کو تیز تر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ناٹو میں بھی مشرق وسطی کے دفاع کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اور اس پر زور دیا گیا کہ اس کے متعلق ضروری اقدامات جلد سے جلد ہونے چاہیئں۔ تاکہ یہ خلا پُر ہو جائے۔

اردو سٹینوگرافر کی ضرورت

طلوع اسلام کے لئے ایک اچھے اردو سٹینوگرافر کی ضرورت ہے۔

تنخواہ اور تقرری کا فیصلہ ٹیسٹ کے بعد ہوگا۔

ضرورتمند حضرات فی الفور ناظم ادارہ سے ملاقات کریں۔

بیرونی حضرات کو اپنے خرچ پر ٹیسٹ کے لئے کراچی آنا ہوگا

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یکمشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

نظام ربوبیت

(از - پرویز)

شائع ہوگئی ہے - اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال - یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے - انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے - رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے - چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے -

قسم اول : کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھہ روپے

قسم دوم : کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ - چار روپے

دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے -

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں - جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں قسم اول از خود بھیجدی جائیگی - اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں یا قسم دوم لینا چاہیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ۲۷ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۱۷	کراچی: ہفتہ - ۲۸ - مئی ۱۹۵۵ء	قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

دین میں فرقے پیدا ہو جانا کفر ہے - شرک ہے - عذاب ہے - سوال یہ ہے کہ جب دین میں فرقے پیدا ہوجائیں تو ان کے مٹانے کی کیا صورت ہے؟ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے - اور وہ خود خدا کی بتائی ہوئی ہے - اس نے اپنے رسول سے (اور رسول کی وساطت سے تمام مومنین سے) کہا کہ اتبع ما اوحی الیک من ربک - جو کچھ تیرے نشو و نما دینے والے کی جانب سے تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو - لاالہ الاھو - اور اس حقیقت کو ہر وقت یاد رکھو کہ اقتدار اور قانون صرف اسی کا ہے - اس کے سوا کسی اور کے قانون کی اتباع جائز نہیں - تم اس روش کو اختیار کرو اور اس طرح واعرض عن المشرکین (۶/۱۰۷) تم مشرکین سے الگ ہو جاؤ - ان سے اعراض برتو -

شرک کے راستے سے اعراض برت کر خالص توحید کا راستہ اختیار کرنے کا یہ طریقہ ہے - یعنی مایوحیٰ کی اتباع -

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ------

1. تنہا عقلِ انسانی، زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں صحیح ہیں جو اس کے خلاف ہیں غلط ہیں۔
4. حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جاتی ہے اور کوئی فردِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)
8. ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ------

اسلام (پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں) اسی قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ودیعت شدہ صلاحیتیں کامل نشو و نما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ پاکستان کا دل ★ شہری خطرہ ★ مودودی صاحب کو چیلنج ★ "اخلاقی نامرد" ★ کشمیر کا مسئلہ
★ سوئی گیس ★ تاریخی شواہد ★ اسلام کی سرگزشت ★ ابن جریر طبری ★ مجلس اقبال ★ عورت کا قرآن
★ حقائق و عبر ★ باب المراسلات ★ بین الاقوامی جائزہ ★ عالم اسلامی ★ بزم طلوع اسلام

تازہ پیشکش

اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء نمبر ۱۷

پاکستان کا دل

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

پنجاب کو قائدِ اعظم نے پاکستان کا دل کہا تھا اور دیکھا جائے تو یہ علاقہ فی الواقعہ جسدِ پاکستان میں بمنزلہ دل کے ہے۔ دل کا مقام جسم میں کسی تشریح کا محتاج نہیں اس کی صحیح حرکت پر سارے جسم کی صحت بلکہ زندگی اور موت کا دارومدار ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جسدِ پاکستان کی صحت سے متعلق چنداں خوش فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اس مرکزی عضو کا عمل کبھی درست نہیں ہوا۔ قیامِ پاکستان کے وقت سینۂ پنجاب پر ریڈ کلف ایوارڈ کا نشتر چلا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ آگ اور خون کا جو ہولناک کھیل بھی کھیلا پڑا اور کٹ کر دو ٹکڑے بھی ہو گیا پڑا۔ جس سے لاکھوں مسلمان تہِ تیغ ہوئے اور لاکھوں تباہ حال اسی کی پشتِ ناتواں کا بوجھ بن گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد تقسیم و افتراق کا بیج کچھ اس انداز سے پنجاب کی زرخیز زمین میں بو دیا گیا کہ اس بدقسمت صوبے کو توازن کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ قائدِ اعظم کی حینِ حیات میں ہی اربابِ سیاستِ پنجاب کی خانہ جنگی اس قدر گھناؤنی ہو گئی تھی کہ ان کی ساعیِ مفاہمت یکسر ناکام ہو گئیں۔ قائد کے انتقال کے بعد سیاست کا جو دور شروع ہوا اس کا دارومدار ہی ریشہ دوانی اور سازش پر تھا۔ اس پر پاکستان کے دل پر دورے پہ دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ اگر آج تک یہ دل حرکت کرتا رہا ہے تو یہ اس کی غیر معمولی سخت جانی کی نشانی ہے، مرض کی شدت کی کمی کا ثبوت نہیں۔ لیاقت علی خاں مرحوم کے زمانہ میں بھی پنجاب کی وزارت سازشوں کی آماجگاہ بنی رہی۔ خواجہ ناظم الدین کا عہد شروع ہوا تو اس کشمکشِ اقتدار میں بنگالی عنصر کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اس دوران میں پس پردہ جو کچھ ہوتا رہا اس کا ہلکا سا نقشہ اس وقت سامنے آیا جب پنجاب بُرزائیت کی تحریک کے جہنم سے نکلا اور اس تحریک کے متفرق کردار تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے۔ اس کی تفصیل میں اب جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی یاد ہنوز دلوں میں تازہ ہے۔

فسادات کی آگ فرو ہوئی تو خیال پیدا ہوا کہ شاید اس صوبے کی قسمت اب پلٹا کھائے اور اس کی سیاست اپنا رُخ صحیح منزل کی سمت کرے۔ تحریک کے دوران کے وزیرِ اعلیٰ، میاں دولتانہ وزارت سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے خود ملک فیروز خاں کا نام بطور جانشین تجویز کیا۔ عنانِ وزارت ان کے سپرد کر کے وہ صوبے کی بلکہ ملکی سیاست سے کم سے کم وقتی طور پر کنارہ کش ہوتے نظر آئے اور یورپ سدھار گئے۔ مگر مرکزی سیاست نے ان کی فوری واپسی کے اسباب پیدا کر دیئے۔ برطرف شدہ مجلس دستور ساز نے ایسی بساط بچھائی کہ ہواؤں کے بندے، عہدوں کے بھوکے اور ملک کے دشمن اپنے اپنے سروں پر سازشوں کے جالوں کے پشتارے لادے کراچی میں آ موجود ہوئے۔ سیاست کے اسٹیج پر سات سال سے جو گھناؤنا ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا یہ اس کی داستانِ جگر گداز کا انتہائی نقطہ (CLIMAX) تھا۔ مملکت خداداد پاکستان سازشوں کے گراں بار بوجھ کے نیچے دب کر دم توڑ رہی تھی اور روحِ پاکستان زبانِ حال سے پکار رہی تھی۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

اب سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز کراچی بن گیا۔ پنجاب سیاست کے تمام جغادری وہیں جمع ہو گئے۔ سب کی نظریں پنجاب پر تھیں۔ وہ متعجب تھے کہ پاکستان کا یہ دل ابھی تک دھڑک رہا تھا حالانکہ اس کی حرکت کو بند کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ کراچی سے تار ہلائے گئے اور پتلیوں نے ناچ ناچ کر پنجاب کے بیڑے کو یوں ڈگمگائے رکھا کہ

گماں تھا یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے!

کراچی میں سیاسی جوڑ توڑ کے سودے ہوئے اور مطلب برآری کے خفیہ معاہدے کئے گئے۔ "تم پنجاب میں نون وزارت ختم کرنے میں مدد دو اور پنجاب کے فلاں وزیر کو مرکز سے نکلوا دو، ہم بنگالی کی حمایت کریں گے، مغربی پاکستان کو ایک نہیں ہونے دیں گے......" اس ملی بھگت نے کراچی میں آج اس وزیر کے خلاف مہم شروع کی تو کل دوسرے کے خلاف۔ اور لاہور میں کبھی اس سے نون کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک چلائی کبھی وہاں کے مرکز کے وزیر تھے کہ وہ اس سہم میں رہتے تھے کہ وہ آج ہیں تو شاید کل نہ ہوں۔ پنجاب وزارت تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے اور اپنی مدافعت میں لگی رہتی تھی۔

نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اس بساط کو تہہ کر کے رکھ دیا۔ ملک بھر میں خوشی کے شادیانے بجے۔ پاکستان کے جاں بر ہونے کی امیدیں بیدار ہو گئیں۔ مایوس چہرے نئے مستقبل کے تصور سے تمتما اٹھے یہ کچھ ہوتا بھی کیوں نہ۔ ابنائے وقت و بندگانِ ہوس اربابِ سیاست کے خرقۂ سالوس کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھرتی نظر آ رہی تھیں۔ پاکستان کی وحدت و سالمیت کے چرچے ہونے لگے اور یک رنگی و یک جہتی کے امکان پیدا ہونے لگے۔ مرکزی حکومت نے اپنے ماہرین کو وحدتِ مغرب کی تفاصیل طے کرنے پر مامور کیا تو انہوں نے دو تین ماہ میں یہ کار مہم سرانجام دے دیا۔ صوبائی اسمبلیوں نے ایک ایک کر کے اس فیصلۂ وحدت پر صاد کیا۔ حالانکہ انہی کے ارکان اس سے پہلے اس تجویز کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس طرح ایک کمیٹی تسویدِ آئین کے لئے مقرر ہوئی۔ اس نے بھی کم سے کم وقت میں ایک مسودہ تیار کر لیا۔ ملک میں تذبذب کا دور ختم ہوتا جا رہا تھا اور یقین و اعتماد کی فضا پیدا ہو رہی تھی کہ پھر سے مرحب و عنتر اُٹھے۔ اس وقت پتہ چلا کہ میدان میں کوئی اسد اللہ نہیں۔ جیسے دیکھئے جادوئے سامری کا ہلاک اور شیوۂ آذری کا قتیل ــــ اور کسی میں نہ کلیم کا سلیقہ نہ خلیل کا قرینہ۔

اس سے سپیدۂ سحر صبحِ کاذب میں تبدیل ہو گیا اور پھر سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا۔ سندھ سے آواز اٹھی کہ آئین ساز کنونشن کے لئے صرف سندھی منتخب ہوں گے۔ سرحد نے کہا کہ ہم بھی کسی غیر سرحدی کا نام نہیں لیں گے۔ یہ وہی اسمبلیاں تھیں جو چند دن پہلے یہ بلند بانگ قرار دادیں پاس کر چکی تھیں کہ پاکستان جس مکروہ صوبائیت کا شکار ہو چکا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ صوبوں کو یکقلم ختم کر دیا جائے لیکن اس کا کیا علاج کہ صوبوں کی حدیں سطحِ ارض پر نہیں دل کی گہرائیوں میں تھیں۔ مٹی کی لکیریں مٹا دینے سے دل کی لکیریں

نہیں مٹ سکتیں۔ اس کے لئے ضرورت تو یہ ہے کہ ایسے دلوں میں چھری چبھو دی جائے۔ اور اگر پاکستان کو بہ حیثیت پاکستان باقی رہنا ہے تو ان دلوں میں ہی چھری نہیں چبھونا ہوگی بلکہ جن سینوں میں یہ دل ہیں ان سینوں کو خنجر سے شق کر دینا ہوگا۔

بہرحال باقی صوبوں میں صوبائیت کے دیو ناچ رہے تھے کہ پنجاب سے ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا۔ پنجاب کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے نمائندے ان کو چنیں گے جنہیں مرکز نامزد کرے۔ ہم اس فیصلہ کو کسی نام نہاد جمہوری قاعدہ یا اصول کی روشنی میں نہیں دیکھتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسے پاکستان کی سالمیت اور وحدت کی میزان میں تولیں۔ جو فیصلہ اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے ہمارے نزدیک وہ صحیح ہی نہیں بلکہ اصح ہے اور بلا چون و چرا واجب الاحترام اور واجب التعمیل۔ اگر اس سے نام نہاد جمہوریت کی نفی ہوتی ہے تو ہمیں اس کا ذرہ بھر افسوس نہیں اور اگر اس سے بوئے آمریت آتی ہے تو ہم اسے مشام جان کی کشود کا سامان سمجھیں گے۔ ہمارے نزدیک پاکستان کا بقاء تمام امور پر مقدم ہے بشرطیکہ ان امور میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہ ہو۔ جمہوریت کو ہماری بقا کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر اس نظام سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا تو ہمارے نزدیک وہ مردود و مطرود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے پنجاب کے فیصلے کو ہوا کا ٹھنڈا جھونکا کہا ہے۔ کیونکہ اس وقت کہیں نہ کہیں سے یہ نعرۂ مستانہ بلند ہونا چاہیئے تھا کہ ہم اپنے امور کو پاکستانی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے اور نپٹائیں گے۔ کیونکہ ہماری ملی زندگی کا واحد مدار پاکستان کی زندگی پر ہے۔ پاکستان باقی رہا تو ہم بھی باقی رہیں گے اور پاکستان ڈوبا تو ہم بھی غرق ہو جائیں گے اور وزارتوں اور عہدوں کی وہ ساری کرسیاں بھی گرداب ہلاکت کی نذر ہو جائیں گی جن کی خاطر اس وقت کتوں کی طرح لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ یہ نعرۂ مستانہ پنجاب سے بلند ہوا لیکن، آہ، اس خمکدہ کی شراب بھی ہوا خوردہ نکلی۔ ادھر یہ قرارداد منظور ہوئی ادھر اندر اندر زلزلہ آ گیا۔ مرکز پر اعتماد کا اظہار کر کے اور وحدت کا نام لے کر ملک اور قوم کو دھوکا دینے والے ننگے ہو کر ناچ رہے تھے اور ان کے اندھے پن کا یہ عالم تھا کہ وزیر استعفیٰ لئے بیٹھے ہیں تو وہ دستوروں اور قاعدوں کا اتنا لحاظ بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ استعفیٰ اپنے وزیر اعلیٰ کو دیں۔ وہ استعفے بھی دیتے ہیں تو براہ راست گورنر کو دیتے ہیں۔ اور یہ استعفے دیئے کیوں جا رہے ہیں؟ یہ کونسی قیامت آ گئی؟ آج تک تو ہم نے کسی اصول کی خاطر کسی وزیر کو استعفے پیش کرتے نہیں دیکھا؟ یہ مداری کی پٹاری سے نئے نئے سانپ اس لئے نکل رہے ہیں کہ ہر ایک کو ڈر ہے کہ کہیں میری بجائے وہ نہ منتخب ہو جائے۔ کوئی کراچی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے، کوئی گورنر سے آس لگائے بیٹھا ہے اور ایک بھی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ اس افراتفری، نفسا نفسی اور ہڑبونگ میں ملک کا کیا بنے گا؟

اور یہ بھی دیکھئے کہ یہ حامیان افتراق و دشمنان وحدت سب کے سب مسلم لیگ کے ارکان ہیں۔ اگر ان میں ملکی شعور اور ملی سلیقہ نہیں تو ان میں پارٹی ڈسپلن کا شائبہ تک بھی نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ان سے اپیل کریں تو کس نام پر اور واسطہ دیں تو کس کا؟ یہ خود سات سال سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلم لیگ قائد اعظم کا مقدس ترکہ ہے۔ لیکن انہیں کیسے بتایا جائے کہ اگر قائد اعظم کی مسلم لیگ پاکستان کو عدم سے وجود میں لائی تھی تو ان کی مسلم لیگ پاکستان کو وجود سے عدم کی طرف لیجا رہی ہے (ضمناً یہ واضح رہے کہ اگر مسلم لیگ ناکام ہو چکی ہے تو کوئی متبادل جماعت ایسی نہیں ابھری جس سے کچھ حسن ظن قائم کیا جا سکے۔) آج اگر قائد اعظم بھی کسی طرح ان اخلاف کو دیکھ لیں تو وہ یقیناً ان سے برأت اور بیزاری کا اعلان کر دیں۔ لیکن قائد اعظم آنے سے رہے اور یہ اعلان بے تعلقی ہونے سے رہا۔ اس کا پتہ اس وقت چلے گا جب فطرت کے قانون مکافات کے مطابق ظہور نتائج کا وقت آئے گا۔ اور ان کی ایک ایک سیہ کاری ان کے سامنے آ جائے گی۔ اس وقت آپس میں بے کار باتوں پر لڑنے کو مقصود زندگی سمجھنے والے "قسطنطنیہ کے یہ پادری" روئیں گے اور کہیں گے

یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا

لیکن مشیت ایزدی نہ کسی کے رونے دھونے سے اپنا اصول بدلتی ہے نہ ان کے اٹل نتائج پیدا کرتی ہے۔ قوموں کی ہلاکت و تباہی متعین قانون کے مطابق عمل میں آتی ہے۔ اور جب تباہی اعمال کی بدولت مقدر ہو جاتی ہے تو فطرت یہ نہیں سوچتی کہ پاکستان کو چند دن اور جینے دو کیونکہ اس نے زندگی کے تھوڑے سے سانس ہی پورے کئے ہیں۔ وہ بڑی بڑی باجبروت قوموں کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ آپ کس باغ کی مولی ہیں؟

ملک پر یہ عذاب مسلط کر کے اور اندر اندر سے اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے بعد یہ لیڈر سوچتے ہیں کہ ہمارے مسائل ملی طے کیوں نہیں ہوتے؟ کیوں لاکھوں مہاجرین زندگی اور موت کی جانگسل کشمکش میں مبتلا ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ صنعتیں ملکی تو بڑھتی جا رہی ہیں لیکن اہل ملک محروم تر ہوتے جا رہے ہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ ہندوستان کشمیر کے معاملہ میں ہمیں منہ تک نہیں لگاتا۔ یا وقتاً فوقتاً مذاکرات کا چکر دے کر ٹکا سا جواب دے کر ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کو لوٹا دیتا ہے؟ پاکستان کیوں زندگی کی مصاف میں پھسڈی ثابت ہو رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان سوالوں کے جوابات کچھ مشکل نہیں۔ انہیں مشکل بنا رکھا ہے آپ لیڈروں کی خانہ جنگی اور سر پھٹول نے۔ کیا اس کے خاتمے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ ہم پنجاب کے قائدین سے نہایت دل سوزی سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو، رسول کا ادب نہ ہو، قرآن کا احترام نہ ہو، قائد اعظم کی عزت نہ ہو، نہ سہی، چھوڑیئے ان سب کو لیکن اتنا ہی سوچئے کہ آپ کو یہ مناصب ملے ہیں تو پاکستان کی بدولت، اور یہ باقی رہیں گے تو پاکستان کے دم سے باقی رہیں گے۔ آپ اپنی غرض کے لئے ہی سہی پاکستان کو برقرار رکھئے۔ اقبال نے جو کچھ خودی کے متعلق کہا تھا وہی آپ پاکستان کے بارے میں سمجھئے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

باقی رہا یہ کہ ہمیں پاکستان کے استحکام و بقا کی اس قدر فکر کیوں ہے؟ تو ابتداءً اس لئے کہ کسی آزاد مملکت کا وجود اس کے رہنے والوں کے لئے باعث ہزار سرفرازی ہوا کرتا ہے اور ملک کی غلامی دنیا کی بدترین لعنت ہوتی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ حضرات کی اس قسم کی سطحی مفاد پرستیوں سے اس مملکت کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور انتہاءً اس لئے کہ پاکستان وہ خطۂ زمین ہے جس میں ہم اس قرآنی نظام کے قیام کے امکانات دیکھتے ہیں جو نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ایک مرتبہ عملاً متشکل ہوا تھا اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھ اس وقت تک وقفِ انتظار ہے۔

لہٰذا یہ خطۂ زمین اور اس کی سالمیت ہمیں دنیا کی ہر چیز، حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور ہر ایسی حرکت جس سے اس کی سالمیت پر کسی انداز سے بھی زد پڑتی ہو، ہمارے لئے زلزال قیامت سے کم نہیں ہوتی۔

کے توانم دید زاہد، جام صہبا بشکند
مے پرد در نغمہ حبابے گر بدریا بشکند

شہری خطرہ

مثل مشہور ہے کہ کوئی عقلمند شخص اس شاخ کو اپنی طرف سے نہیں کاٹے گا جس پر وہ خود بیٹھا ہے اسے اس حد تک صحیح سمجھا جاتا ہے کہ اس کے خلاف جانے والے کو فاتر العقل سمجھا جائے گا۔ لیکن جب اسی عقل کی بنا پر ایک معاشرہ متشکل ہو جائے تو پھر آپ ایک کونے سے دوسرے کونے تک نکل جائیے، ایک ایک شخص کو دیکھئے، آپ کو شاید ہی کوئی ایسا فرزانہ ملے گا جو اس خطرناک کھیل میں مصروف نہ ہو۔ شاخیں کٹ رہی ہوں گی، افراد گر مر رہے ہوں گے، لیکن کوئی نہیں سوچے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ دراصل عقل کا تقاضا ہی یہی ہے بقول اقبال عقل

سود خود بیند نہ سود غیر

وہ اپنا نفع سوچتی ہے اور تندہی سے اس کے حصول میں لگ جاتی ہے اور یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ

سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

جب ایک ٹہنی کٹتی ہے تو اس سے کاٹنے والے ہی کا جسم چور نہیں ہوتا اور بیسیوں کے انجر پنجر اس سے ڈھیلے ہوتے ہیں۔ طلوع اسلام نے متعدد تحریروں میں اس اصول کی شرح و بسط سے وضاحت کی ہے (تازہ اور مفصل کوشش "نظام ربوبیت" ہے) اور اب اس کے ثبوت کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے لیکن ایک چھوٹی سی مثال سے یہ پتہ چلے گا کہ عقل کے فساد کی گیرائی کہاں تک ہے۔ کراچی میں گلیوں اور سڑکوں پر جگہ بہ جگہ سوراخ ہیں جو زمین دوز نالیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان سوراخوں پر لوہے کے ڈھکن رکھے ہوتے ہیں تاکہ راہ چلتوں کے لئے کوئی خطرہ نہ رہے۔ یہ لوہے کے ڈھکن برسوں سے چرائے جا رہے ہیں۔

جس کی وجہ سے جابجا سوراخ ننگے ہو گئے ہیں۔ ان کے کھلے رہنے کی وجہ سے روح فرسا حادثات ہو چکے ہیں۔ مثلاً ایسا ہوا ہے کہ بچے کھیلتے کھیلتے ان میں گر گئے اور گندی نالی میں ڈوب کے مر گئے۔ بعض جگہ یہ سوراخ بڑے وجہ خطرناک تر ہو جاتے ہیں کہ نیچے سے گندہ پانی امڈ کر سڑک پر پھیل جاتا ہے اور سوراخ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ اس پانی میں جانے والے بچے بے خبری میں اس سوراخوں سے نالیوں میں بہ گئے۔

یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ چند افراد اپنی عقل کی رو سے سوچتے ہیں کہ مفت میں ہاتھ آئے لوہے کے ڈھکن بیچے جائیں تو سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اور یہ ہے بھی ٹھیک کیونکہ ان کو جتنے پیسے بھی میسر آجائیں وہ ان کا منافع ہے۔ ان کی قیمت تو خرید کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جہاں معاشرے کا ایک فرد پیسے رول رہا ہوتا ہے وہاں اس معاشرے کا دوسرا فرد شہر بھر کی سیال غلاظت میں ڈوب کر چرائے ہوئے ڈھکن کی قیمت ادا کر رہا ہوتا ہے۔

یہ وجہ تو اس جرم کے ارتکاب کی ہے۔ اور یہ جرم مرتکب ہوتا اس لئے چلا جاتا ہے کہ معاشرہ کے دوسرے افراد بالعموم عقل کی رو سے اپنے آپ کو یہ اطمینان دیئے رہتے ہیں کہ نہ تو چرایا جانے والا ڈھکن ان کا اپنا ہے اور نہ بدرو میں مرنے والا شخص ان کا کچھ لگتا ہے۔ عقل مفاد عاجلہ کا یہ تصور شدید تیار کرکے اس کی علت وہیت میں محو رہتی ہے اور نہیں دیکھتی کہ کیسی گندی نالیاں اس کی جیٹروں کو کھو کھلا کئے جا رہی ہیں۔

جب معاشرہ میں یہ بحرانی صورت پیدا ہو جاتی ہے
تو قرآن اس کا حل یہ بتاتا ہے۔
ثم کان من الذین امنوا وتواصوا
بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ (۹۰)
پھر انسان ان لوگوں میں سے ہو جائے جو ایمان
لائے اور جنہوں نے ایسا معاشرہ پیدا کر لیا
جس میں ہر فرد دوسرے کو گرنے سے بچائے
اور سامان نشو و نما بہم پہنچانے کی تلقین کرتا ہے

سارے معاشرے کو اس اصول پر ڈھالنا تو خیر بڑی بات ہے لیکن اگر افراد معاشرہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں اسے نافذ کرتے جائیں تو خاطر خواہ نتائج نکلنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ نالیوں کے ڈھکنوں کے سلسلہ میں اگر ہر علاقے کے رہنے والے اپنے آپ کو ان کا محافظ سمجھنا شروع کر دیں تو اس عظیم شہری خطرے کا بہت حد تک تدارک ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ ہر ڈھکن پر ہر وقت ایک پولیس کا آدمی پہرہ دیتا رہے لیکن محلہ دار رضا کارانہ نگہداشت بہت مشکل کام نہیں ہوگا! کراچی کارپوریشن نے بجا طور پر اہل شہر سے اپیل کی ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔ ہمیں توقع ہے کہ اہل شہر اپنی شہری ذمہ داریوں کو محسوس کرکے ایک عمدہ مثال قائم کریں گے۔

واضح رہے کہ ہم نے ڈھکن کے واقعات کو محض بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ ہمارے معاشرہ میں ہر جگہ اور ہر وقت سینکڑوں کام اسی انداز کے ہو رہے ہیں جن میں ایک شخص اپنے ایک پیسے کے ناجائز فائدے کے لئے ملت کا ہزاروں روپے کا نقصان اور سینکڑوں جانوں کا اتلاف کر دیتا ہے، اور اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

مودودی صاحب کو چیلنج

ہم نے طلوع اسلام کی اشاعت بابت ۴ار اپریل میں مودودی صاحب کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ وہ اپنی جماعت کو سمجھائیں کہ کسی کے خلاف ناحق تہمت تراشی شریفانہ مسلک نہیں ہے۔ اور انہوں نے طلوع اسلام کے خلاف بہتان باندھنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اسے بند کریں۔ اور سیدھی طرح دلائل و براہین سے بات کا جواب دیں۔ لیکن ہمیں علم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ خود مودودی صاحب کے ایما اور منشا سے ہو رہا ہے اور وہ بھی اس مہم میں برابر کے شریک ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۵ رمئی کو جماعت اسلامی لاہور کے ہفتہ وار اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے (منجملہ دیگر امور جن کے متعلق ہم کسی دوسری نشست میں گفتگو کریں گے) فرمایا

فتنہ انکار حدیث حکومت کی سرپرستی میں چل رہا ہے اور اس کا سارا کاروبار ان لوگوں کی توجہات کا مرہون منت ہے، جو حکومت میں دخل رکھتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ایک طرف حکومت کی طرف سے سرکلر بھیجے جا رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر کے پاس نہ پھٹکا جائے..... لیکن اس کے برعکس ایسے تمام عناصر کو سرکاری امداد دی جا رہی ہے جو مسلمانوں میں فکری انتشار پھیلانا چاہتے ہیں اور دین کے بنیادی تصورات پر کاری ضربیں لگا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی نے طلوع اسلام اور ثقافت اسلامیہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ فوجی اور سول حکام میں کھلم کھلا ان چیزوں کو لیجایا جا رہا ہے۔
(تسنیم۔ بابت ۱۷ رمئی ۱۹۵۵ء)

یہ بہت اچھا ہوا کہ مودودی صاحب نے طلوع اسلام کا نام کھل کر لیا۔ اس سے بات بالکل واضح ہو جائے گی (بشرطیکہ محترم مودودی صاحب کو اپنے کہے کا کچھ بھی پاس اور دیانت و شرافت کا کچھ بھی لحاظ ہے) ہم مودودی صاحب کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ ثابت کریں کہ

(۱) طلوع اسلام کو حکومت کی طرف سے کسی قسم کی امداد ملتی ہے (یا کبھی ملی ہے)

(۲) طلوع اسلام کو حکومت کی طرف سے فوجی اور سول حکام میں لے جایا جا رہا ہے۔ اور

(۳) طلوع اسلام کا کاروبار ان لوگوں کی توجہات کا مرہون منت ہے جو حکومت میں عمل دخل رکھتے ہیں۔

مودودی صاحب اس کا جو جواب بھی بھیجیں گے ہم اسے طلوع اسلام میں شائع کریں گے۔ ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ مودودی صاحب پر زور دیں کہ وہ طلوع اسلام کے خلاف عائد کردہ الزامات کو ثابت کریں۔ اور اگر وہ اس سلسلہ میں کوئی جواب نہ دیں، یا جواب دیں اور ان الزامات کو ثابت نہ کر سکیں تو ہم اس طبقہ سے دریافت کریں گے کہ وہ بتائے کہ جو شخص اس طرح دوسروں کے خلاف بہتان تراشی سے کام لے، سوسائٹی کو اس کے خلاف کچھ کرنا چاہیئے (کہ وہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکات سے باز آجائے) یا اسے بلا باز پرس کے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے کہ جس کے خلاف جو جی میں آئے کہتا چلا جائے؛ سوچئے کہ اس طرح اس معاشرہ میں کسی شریف آدمی کی عزت بھی باقی رہ سکے گی؟

"اخلاقی نامرد" کون ہے؟

۱۷ رمئی کے روزنامہ تسنیم میں "اخلاقی نامرد" کے عنوان سے حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

برکت علی محمڈن ہال میں حدیث کی اہمیت سنت اور حدیث کے فرق ان کے باہم تعلق اور فتنہ انکار حدیث پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا مودودی نے فرمایا کہ ہماری مخالفت کرنے والے لوگ ایسے اخلاقی نامرد ہیں کہ سامنے آکر دلائل سے بات کرنے کے بجائے بھونڈے طریقوں سے مخالفانہ جدوجہد شروع کئے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے پاس دلیل سے قائل کرنے کی ہمت ہوتی تو یہ لوگ کھل کر سامنے آتے۔ ہماری بات سنتے اور اپنی سناتے، اپنی بات پیش کرتے اور ہمارے لٹریچر کو پیش کرنے کا موقع دیتے، لیکن انہیں خطرہ ہے کہ اگر لوگ یہ لٹریچر پڑھ گئے تو ہمارے فتنے نہ چل سکیں گے۔

پرانی باتوں کو تو چھوڑیئے۔ طلوع اسلام نے

(۱) اپنی ۲۰ر اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں "سنت رسول اللہ" کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ افتتاحیہ لکھا اور جماعت اسلامی سے بالخصوص درخواست کی کہ وہ ہمیں بتائیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اور اگر غلط ہے تو کس مقام پر، تاکہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں۔

(۲) طلوع اسلام کی مذکورہ صدر اشاعت میں ہم نے محترم مودودی صاحب کی تحریروں پر مشتمل، قرآن و سنت کے موضوع پر ایک مفصل مقالہ شائع کیا اور جماعت اسلامی سے درخواست کی کہ وہ بتائیں کہ اس باب میں ہم نے کوئی غلط بات تو پیش نہیں کی۔

(۳) طلوع اسلام میں یہ درخواست شائع کرنے کے بعد، ہم نے محترم امین احسن صاحب اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں نجی خطوط لکھ کر ان کی توجہ اس طرف منعطف کرائی۔

(۴) جب ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہ آیا تو ہم نے ۱۶ر اپریل کے طلوع اسلام میں ان کی توجہ پھر اس طرف مبذول کرائی۔

(۵) ۳۰ اپریل کے شمارہ میں ہم نے اسے پھر دہرایا۔

(۶) ۷ مئی کے پرچہ میں ہم نے محترم امین احسن اصلاحی اور عبدالغفار حسن صاحب سے درخواست کی کہ وہ سنت رسول اللہؐ کے متعلق اپنے مؤقف کو واضح فرمادیں۔

(۷) ۱۴ مئی کے طلوع اسلام میں ہم نے خود محترم مودودی صاحب سے درخواست کی کہ وہی اس طرف توجہ فرمائیں اور سنت رسول اللہؐ کے متعلق ہمیں ہماری غلطیوں سے متنبہ فرمادیں۔

ان میں سے کسی بات کا جواب اس وقت تک نہ ہمیں براہ راست موصول ہوا ہے اور نہ ہی جماعت اسلامی کے کسی جریدہ میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

اس کے بعد ہم محترم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ براہ کرم بتادیں کہ کھل کر سامنے آنے اور دلائل و براہین سے بات کرنے کا اور کونسا طریقہ ہوتا ہے؟

اور ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس باب میں (مودودی صاحب کے الفاظ میں) "اخلاقی شناھد" کون ہے؟

مذاکرات کشمیر

وزیر اعظم پاکستان پنڈت نہرو سے مل کر واپس آگئے ہیں۔ وہ کیا کرکے آئے ہیں اس کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ دلی سے دونوں وزرائے اعظم کا جو مشترک اعلامیہ شائع ہوا ہے اس میں صرف اسی قدر مذکور ہے کہ کشمیر کے جملہ پہلوؤں پر غور کیا گیا اور یہ کہ دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات دوبارہ ہوگی۔ اس ملاقات کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔

دلی میں کیا ہوا؟ اس کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ خود وزیر اعظم نے کچھ نہیں بتایا۔ البتہ انہوں نے مذاکرات سے متعلق اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ جہاں کہیں سے کوئی خبر آئی ہے وہ مایوس کن ہے۔ دھلی کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان نے یہ بھی منظور کیا کہ ایڈمرل نمٹز ناظم استصواب نہ ہوں۔ یہ بھی کہ امریکہ سے فوجی امداد بند کردی جائے گی۔ اور غیر جانبداری کی راہ اختیار کی جائے گی۔ اور یہ بھی کہ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ سے واپس لے لیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود پنڈت جی نہ مانے وہ مانتے بھی کیسے؟ وہ تو ایک بات مان سکتے ہیں اور وہ یہ کہ پاکستان اپنے آپ کو ان کے قدموں میں ڈال دے۔ ہمارے وزیر اعظم ابھی تک یہاں تک نہیں پہنچے۔ لیکن جس طریق سے وہ ۱۹۵۳ء سے اپنے "بڑے بھائی" کے سامنے رفتہ رفتہ ہتھیار ڈالتے جارہے ہیں اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دو ایک ملاقاتیں اور ہوئیں تو یہ پیش کش بھی کردی جائے گی۔

وزیر اعظم صاحب نے فرمایا ہے کہ دلی کانفرنس کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اور قریب سے دیکھ سکے ہیں۔ ہم وزیر اعظم صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ نے پنڈت نہرو کو واقعی قریب سے دیکھا ہے تو کیا پھر بھی آپ کی آنکھیں نہیں کھلیں؟ آپ یہ نہیں سمجھے کہ وہ کیوں چھ سال سے استصواب کو ٹالتے چلے آرہے ہیں؟ اور اب بھی کیوں وہ کسی معقول تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے؟ اگر یہ کچھ نہیں سمجھے تو خدا کے لئے کشمیر کے چالیس لاکھ مظلومین کے حال تباہ پر رحم کریں اور ان کو پنڈت نہرو کے قدموں پر بھینٹ چڑھانے سے باز رہیں۔

ہم وزیر اعظم کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ کشمیر ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہندوستان اس پر معقول بات کرنے اور سننے کے لئے تیار نہیں تو اس سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھا جائے۔ کشمیر کو تمام ہندی پاکستانی تنازعات پر فوقیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اگر ہندوستان دیگر معاملات میں مفاہمت پسندی کا ثبوت دیتا ہے تو اس سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے مطالبہ کیجئے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ میں دیانتداری کا ثبوت دے اور جب تک کشمیر میں وہ معقولیت کا رویہ اختیار نہیں کرتا کسی اور مسئلے میں اس سے گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسے ملک سے دوستی اپنے آپ سے دشمنی ہے جو ہماری شاہ رگ پر قابض ہے لیکن ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔

ہم وزیر اعظم سے یہ بھی گزارش کریں گے کہ وہ ازرہ کرم قوم کو صاف صاف بتائیں کہ دلی میں وہ کیا کرکے آئے ہیں۔ اگر وہ قوم پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو انہیں قوم سے بھی جوابی تعاون کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ انہوں نے اپنے بیان میں پریس سے درخواست کی ہے کہ وہ ان سے کشمیر کے بارے میں تعاون کرے۔ ہم حیران ہیں کہ ہم سے کس قسم کے تعاون کی توقع کی جارہی ہے؟ کیا ہم کشمیر کو ذبح ہوتا دیکھیں اور لب کشائی نہ کریں اگر تعاون سے مراد یہ کچھ ہے تو ہم مجبور ہیں کہ اس اپیل پر مطلقاً کان نہ دھریں۔ آپ اس قسم کا تعاون پتھروں سے لے سکتے ہیں، ذی احساس انسان سے نہیں۔

سوئی گیس کا استعمال

سوئی گیس قدرت کا ایک بے نظیر عطیہ ہے اور اگر اس کا مناسب استعمال کیا گیا تو پاکستان کی معیشت میں بجا طور پر ایک خوش آئند انقلاب کی توقع کی جاسکتی ہے قدرتی گیس ایندھن کا بدل ہی نہیں نعم البدل ہے۔ کیونکہ یہ باورچی خانوں، موٹر کاروں، ریل گاڑیوں، کارخانوں بجلی گھروں غرضیکہ جہاں کہیں کسی قسم کا ایندھن استعمال ہوتا ہے یکساں طور پر استعمال ہوسکتی ہے۔ بعض جگہ تو یہ رائج ایندھن سے کہیں بہتر ثابت ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ بہت ارزاں ہے۔ سوئی کے مقام پر جب تین سال پیشتر قدرتی گیس دریافت ہوئی تو اندازہ لگایا گیا تھا کہ اس کا ذخیرہ ساٹھ سال تک کارآمد ہوسکے گا۔ بعد میں یہ اندازہ سو سال کا ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گیس کا ذخیرہ بہت کافی ہے۔ لیکن اس کے استعمال میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ایندھن کے معاملہ میں پاکستان کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ لہذا یہ احتیاط برتنے کی اشد ضرورت ہے کہ اس کا استعمال ایسے شعبوں میں ہو جہاں اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ملک کو پہنچ سکے۔ اب تک یہ انتظام کیا جارہا تھا کہ کراچی کے کارخانوں کو گیس مہیا کی جائے اور ایک لائن کے ذریعہ اسے پنجاب میں پہنچایا جائے۔ اور یا تو پنجاب کے کارخانوں کو براہ راست گیس پہنچائی جائے یا اس گیس سے بجلی کے کارخانے چلاکر کارخانوں کو بجلی مہیا کی جائے۔ یہ گیس کا موزوں ترین استعمال ہے کیونکہ اس سے پاکستانی مصنوعات کی لاگت کم ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ ہمارے کارخانوں کو ایندھن پر کثیر صرفہ کرنا پڑتا ہے) اور اس کا عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اٹلی سے ماہرین آرہے ہیں جو اس گیس کے ریلوں میں استعمال کا جائزہ لیں گے۔ یہ بھی ایک معقول تجویز ہے۔ ہمارے ہاں ریلوے سفر کافی گراں ہے۔ لہذا اگر مہنگے کوئلے یا تیل کی بجائے سستی گیس کا استعمال شروع ہو جائے تو ریلوے سفر غریب عوام کے لئے سستا بنایا جاسکتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی خبر ہے کہ اٹلی کے ماہرین سے یہ بھی استصواب کیا جائے گا کہ کیا پٹرول کی بجائے موٹر کاروں میں گیس کا استعمال ہوسکتا ہے یا نہیں۔ ایسا استعمال اٹلی میں ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے کاروں کا خرچ ایک تہائی کم ہو جاتا ہے۔ اگر کاروں کا خرچ ایک تہائی کم ہو جائے تو اس سے "اصحاب کار" یقیناً خوش ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گیس کے صرف کی وہ تمام جگہیں ختم ہوگئی ہیں جو قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہیں؟ کاروں کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ محض امیروں کے استعمال کی چیز ہے، اس سے غریبوں کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ عوام کا فائدہ اس میں ہے کہ کاروں کی بجائے گیس کو لاریوں اور بسوں میں استعمال کیا جائے تاکہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک اور شہروں کے اندر سفر آسان اور سستا ہو۔ نیز یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ بڑے بڑے شہروں میں بسیں اور موٹر کاریں اس کثرت سے بڑھ رہی ہیں کہ ٹریفک کا انتظام بھی بڑا مشکل ہوگیا ہے اور حادثات بھی زیادہ ہوگئے ہیں۔ یورپ میں اس چیز کو محسوس کیا جانے لگا ہے کہ ٹریفک کے ہجوم اور بڑھتے ہوئے حادثات کو قابو میں لانے کے لئے بسیں زیادہ کی جائیں اور کاریں کم ظاہر ہے کہ اگر بسوں کا سفر اطمینان بخش ہو جائے تو کاروں کی طرف توجہ کم ہو جائے گی۔ اور اس طرح کاروں پر صرف ہونے والا روپیہ بہتر مصارف کی طرف منتقل ہوسکے گا۔

تاریخی شواہد

(۱)

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (۷/۶۶)

اس پر قوم کے مرفہ الحال لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا کہ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو۔

اس کے جواب میں حضرت ہودؑ نے فرمایا

قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ ... فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (۷/۶۷-۶۹)

ہودؑ نے کہا "بھائیو! میں احمق نہیں ہوں۔ میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں۔ میں اس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں، اور یقین کرو کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں۔ کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تمہیں میں سے ہے؟ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔

ان آیاتِ جلیلہ میں دو تین باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ نشۂ دولت و حکومت میں سرمست انسان دعوت الی الحق کو کس طرح نفرت و استہزاء سے ٹھکراتا ہے إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ اور إِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ پر غور کیجئے۔ تمرد و سرکشی کی بدمستیاں کس طرح جھلکتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ پھر مقابلہ میں جواب دیکھئے کس قدر متانت و سنجیدگی کا مظہر ہے۔ شکن بجبیں نہیں۔ کف بدہاں نہیں۔ نفس برآتش نہیں۔ گالی کا جواب (معاذ اللہ) گالی نہیں۔ کوئی اوچھا پن نہیں۔ سفاہت نہیں۔ اپنے مقام بزرگ و بلند پر پہاڑ کی طرح محکم کھڑے ہیں۔ اس لئے کہ اپنی دعوت کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہے۔ قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کی مخالفت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قوم مخالف کے جدال و قتال کی نسبت، ان کی طرف سے تکذیب و استہزاء کا ذکر بڑا نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ جدال و قتال بھی اپنے مقام پر آزمائش کی گھاٹیاں ہیں۔ لیکن ایک داعی و مصلح کی راہ میں تکذیب و تحقیر کی منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ عام انسانوں پر نگاہ ڈالئے۔ وہ بالعموم بڑی بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کر لیں گے۔ لیکن جونہی ان پر کسی نے تنقید (CRITICISM) کی یا ان کا استہزاء (RIDICULE) کیا۔ ان کی بات کو جھوٹا بتایا۔ ان کی دعوت کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً آپے سے باہر ہو گئے اور پھر اس کے بعد ایسی چوکڑی بھولے کہ حصول مقصد و نصب العین کے لئے تگ و تاز کے بجائے، اسی تنقید و تنقیص کی خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ استہزاء و تنقیص کے مرحلہ میں دامنِ ضبط و استقامت کو ہاتھ سے نہ دینا، فی الواقعہ من عزم الامور ہے اور آسمانی انقلاب ربوبیت کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ سردارانِ قوم کی اشتعال انگیز تنقیص پر نگہ ڈالئے اور اس کے بعد حضرت ہودؑ کے متین و سدید جواب پر، حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دوسری چیز وہی ذہنِ انسانی کی عجوبہ پسندی! یعنی قوم کو حیرت و استعجاب اس امر کا ہے کہ انہی جیسا ایک انسان (رَجُلٌ مِّنكُمْ) اور دعوائے رسالت! قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ (۱۴/۱۰) (انہوں نے کہا کہ تم تو محض ہمارے جیسے ہی ایک انسان ہو) اور کوئی مافوق الفطرت چیز بھی تمہارے پاس نہیں " مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ " (۱۱/۵۳) اس لئے

مَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۱/۵۳)

تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اور نہ ہی تمہاری بات مان سکتے ہیں۔

پھر وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ تم جو (معاذ اللہ) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو اس کا سبب ہماری سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں آتا کہ تم نے جو ہمارے دیوی دیوتاؤں کی تکذیب کی ہے تو تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ (۱۱/۵۴)

ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ تمہارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے (اسی لئے تو اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے)

یہ جگر سوز طعن و تشنیع دیکھئے اور پیغمبرانہ جواب ملاحظہ فرمایئے کہ،

قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ (۱۱/۵۴)

ہودؑ نے کہا "میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو، کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے مجھے ان سے کچھ سروکار نہیں۔ میں ان سے سراسر بیزار ہوں۔

۔۔۔۔۔۔۔

یہاں تک تو نشۂ قوت و دولت کی سرمستیوں کے مظاہرے تھے۔ اب دنیائے معتقدات اور اس کی جذبات پرستی کی طرف آیئے! یعنی وہی سازِ کہن کہ چونکہ تمہاری دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ہم میں آباء و اجداد سے متوارث چلا آ رہا ہے اس لئے ہم اس دعوت کی تکذیب کرتے ہیں! وہی اسلاف پرستی اور وہی قدامت پسندی!

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (۷/۷۰)

انہوں نے کہا۔ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک ہی خدا کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کر لیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے آئے ہیں۔

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے اس ادعاء کے جواب میں حضرت ہودؑ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس میں اربابِ فکر و نظر کے لئے حکم و بصائر اور معارف و حقائق کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ فرمایا؛

أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ (۷/۷۱)

جس کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو اس کی حقیقت کیا ہے؟ فقط اتنی کہ وہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لئے ہیں اور جن کے لئے خدا نے کوئی سند نہیں اتاری!

اس چھوٹے سے ٹکڑے پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کتنی عظیم الشان حقیقت اس کے اندر منعکس ہے۔ یہ روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتداء میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا۔ جس کا کچھ نام رکھ لیا گیا۔ جب وہ دو چار نسلیں متوارث چلا آیا تو اس کی پختگی، وجہ تقدس ہو گئی۔ اور وہ نام دل کی انتہائی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ عقل و بصیرت کی کوئی دلیل اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک پتھر، پہاڑ کے کسی گوشے میں پڑا ہے تو فقط پتھر ہے، لیکن اسے کسی چبوترہ پر الگ نصب کر کے اس کا کچھ نام رکھ دیجئے۔ اس نام کی ترویج دو تین نسلوں تک مسلسل ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ اس کی روایتی عظمت دلوں میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی اور اس طرح وہی پتھر جو "گمنامی" کے ایک گوشے میں پڑا تھا قلوب و نگاہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ حالانکہ چشمِ حقیقت بیں کے نزدیک محض نام رکھ دینے سے اس کی ماہیت اور حقیقی قدر و قیمت (INTRINSIC VALUE) میں کچھ فرق نہیں آ گیا۔ اب اس خارجی دنیا سے ہٹ کر ذرا اپنے دماغ کے بت کدہ کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے "پتھر" ایسے رکھے ہیں جن کی قدر و قیمت کے متعلق آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل و شہادت نہیں کہ ان کے نام کی عظمت نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آتی ہے اور محض قدامت کی بنا پر ان ناموں میں شانِ تقدس پیدا ہو چکی ہے۔ دیکھئے کہ یہ نام آپ کے نزدیک کس قدر مقدس بن چکے ہیں کہ ان کے خلاف آپ ایک لفظ تک سننا نہیں چاہتے۔ پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قدر و قیمت کے پرکھنے کے لئے کیا معیار مقرر فرمایا ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ مَا نَزَّلَ اللَّهُ

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے دیگر اقوام اور ممالک کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات، سرحدات پر متمدن عرب مملکتوں کے قیام، عرب میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ کے بعد عربوں کے قومی خصائل اور امتیازات سے بحث کی جاچکی ہے اور علمائے عمرانیات کی آراء کا خلاصہ پیش کیا جاچکا ہے۔ آج کی فرصت میں ابن خلدون اور اولیری کی آراء پر احمد امین صاحب کا تبصرہ پیش کیا جارہا ہے۔

ابن خلدون نے —— اپنی دقت نظر کے باوجود —— عربی اوصاف کی صحیح حد بندی نہیں کی۔ اس وجہ سے ان کی باتوں میں کھلا ہوا اضطراب نظر آتا ہے۔ کہیں ان کا قول پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بادیہ نشین عرب کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو قطعاً متمدن نہ ہو۔ کہ وہ عمارتوں اور اور محلات کو اس لئے ڈھا دیتا ہے کہ اس کے پتھروں سے اپنا چولھا بنا کر اس پر ہانڈی چڑھا سکے اور مکانات کی چھتیں گرا دیتا ہے تاکہ اس کی لکڑیاں اپنے خیموں میں استعمال کر سکے اس قسم کی باتیں ایک انتہائی بادیہ نشین پر ہی منطبق ہو سکتی ہیں۔ نہ کہ اس متمدن عرب پر جو اموی اور عباسی دور حکومت میں ہمیں ملتا ہے۔ اس کے بعد تم دیکھتے ہو کہ وہ عربوں کا یوں تذکرہ کرنے لگتے ہیں کہ نو آبادیاں قائم کرنے میں انھیں صحیح جگہ کے انتخاب کرنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ جیسا کہ کوفہ اور بصرہ کو آباد کرنے میں انھوں نے ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گفتگو ایک انتہائی قسم کے بادیہ نشین عرب کے متعلق نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ عرب ابتدائے اسلام کے وہ عرب ہیں۔ جنھوں نے روم اور فارس کو فتح کیا تھا عرب جو نئے شہر آباد کر رہے تھے۔ یقیناً وہ عرب تو نہیں ہو سکتے محلات کو ڈھا ڈھا کر ان کے پتھروں سے اپنے چولھے بنایا کرتے تھے۔ پھر ابن خلدون کہتے ہیں کہ عرب لوگ علم کے میدان میں کوئی نمایاں کام انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ آزاد شدہ غلام اس میدان میں بھی پیش رو تھے۔ یہ بات بھی عرب کے بادیہ نشینوں یا ابتدائے اسلام میں عربوں سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دور عباسیہ یا آخر دولت امویہ سے متعلق ہے۔ پھر ابن خلدون اپنی ان تمام باتوں کی تردید خود ہی اپنے مقدمہ میں یوں کہہ کر دیتے ہیں کہ عربوں میں طبعی طور پر متمدن بننے اور ساتھ کے رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے والوں سے استفادہ کرنے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ "اس قسم کی باتیں عربوں کو اس وقت پیش آئیں۔ جب انھوں نے فتوحات حاصل کیں اور ایران و روم کے ممالک پر قابض ہو گئے۔ اور ایرانی اور رومی لڑکیوں اور لڑکوں سے خدمت لینے لگے۔ اس وقت تک لوگ کسی طرح کے تمدن اور حضارت سے آشنا نہیں تھے اس قسم کی حکایات ملتی ہیں کہ ان کے سامنے چپاتیاں لائی گئیں تو وہ انھیں کاغذ کے ٹکڑے سمجھے۔ کسریٰ کے خزانوں میں انھیں کافور مل گیا۔ تو انھوں نے اسے نمک سمجھ کر اپنے آٹے میں ڈال لیا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن جب انھوں نے اپنے سے پہلے ارباب حکومت و دولت کو اپنا غلام بنا لیا۔ اور ان سے اپنی ملکی اور خانگی ضرورت میں کام لیا۔ اور ان ضروریات کے لئے ان غلاموں میں سے ماہرین اور منتظمین کا انھوں نے انتخاب کیا۔ تو انھوں نے ان کو سکھایا کہ ان معاملات کی تدبیر و انتظام کس طرح کرنا چاہیئے۔ اور اس کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لوگ ان امور میں انتہا تک پہونچ گئے۔ اور حضارت و تمدن کے بلند ترین مقامات تک ان کی رسائی ہوئی۔ اور کھانے پینے، پہننے کے آلات، اسلحہ، فرش، فروش اور برتنوں کے انتخاب اور تیاری میں وہ عمدہ سے عمدہ چیزیں بنانے اور استعمال کرنے لگے

یہاں سے تم نے دیکھ لیا کہ ابن خلدون عربوں پر حکم لگانے میں مختلف ادوار کے عربوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور پھر ان کے متعلق عام احکام صادر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ انھیں خود ہی اس کا اعتراف بھی ہے کہ عرب لوگ مختلف حالات کے ماتحت بدلتے سدلتے رہے ہیں۔

اس کے بعد اولیری کو لیجئے —— وہ کہتے ہیں کہ "عربی شخص کا تخیل ضعیف اور جذبات جامد ہوتے ہیں" عربوں کے تخیل کو ضعیف قرار دینے کا منشا شاید یہ ہو کہ جو شخص عربوں کے اشعار پر غور کرتا ہے۔ اسے ان میں قصصی اور تمثیلی اشعار کا کوئی نشان نہیں ملتا اسے وہاں طویل و عریض جنگ نامے نظر نہیں آتے۔ جو کسی قوم کے مفاخر و محاسن کا قصر بلند تعمیر کرتے ہیں۔ جیسے ہومر کا الیاڈ اور فردوسی کا شاہنامہ —— نیز اہل عرب کا تخیل آج کے عہد جدید میں بھی افسانے اور ڈرامے تصنیف کرنے میں کسی بلند خیالی اور نکتہ آفرینی کا ثبوت پیش نہیں کر سکا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بالخصوص اس خاص قسم میں عربوں کا تخیل واقعی قاصر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ لٹریچر کی یہ قسم تخیل کا محض ایک مظہر ہے تخیل کا پورا مظہر ہی نہیں ہے۔ فخر، اظہار شجاعت، غزل، تعریف، مدح تشبیہ، مجاز اور اس قسم کی تمام چیزیں تخیل ہی کے مختلف مظاہر ہیں عربوں نے ان موضوعات پر اتنا کچھ کہا ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہیں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ اگرچہ ان میں تخلیق و اختراع کے نمونے بہت کم مل سکتے ہیں۔

پھر غزل کے عشقیہ مضامین، ٹیلوں اور آبادیوں کا رونا۔ ایام دوستی کی یاد۔ وہ مضامین جن میں انھوں نے اپنے شور و وجدان کی تصویر کشی کی ہے۔ یا اپنی بے چینی اور اضطراب کی تصویریں کھینچی ہیں۔ عربوں کے اشعار میں بھری پڑی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں جامد جذبات سے تو صادر نہیں ہو سکتی تھیں رہ گئی جاحظ کی رائے۔ تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ علمائے عمرانیات کی اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے پاس نہ علم تھا نہ فلسفہ۔ نہ ایسی کتابیں جو عہد قدیم سے وراثتہً چلی آ رہی ہوں مگر ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قدرت نے عربوں کو اس کے معاوضے میں دو واضح اور خصوصی امتیازات عطا فرما دیئے تھے۔ طلاقت زبان اور حاضر دماغی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں خصوصیتیں عربوں میں بہت ہی نمایاں ملتی ہیں۔ اس اعتراف کے لئے کہ قدرت کی طرف سے انھیں طلاقت زبان اور حاضر دماغی کا نادر عطیہ بخشا گیا تھا۔ ان ادبی سرمایوں پر ایک نگاہ ڈال لینا ہی کافی ہے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اس تمام بحث سے شاید یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عربوں کے بارے ہماری اپنی کیا رائے ہے۔ وہ اپنے زمانہ جاہلیت اور پھر زمانۂ اسلام میں عقلی اور خلقی ارتقاء کے اعتبار سے ایک ہی درجہ میں نہیں تھے۔ اب ہم صرف جاہلی عربوں کے اوصاف بیان کرنے پر اختصار کرتے ہیں۔

عرب لوگ عصبی مزاج کے آدمی ہیں۔ جنھیں غصہ بہت جلد آجاتا ہے۔ اور ان کا غصہ معمولی سی چیز کے لئے بھڑک اٹھتا ہے پھر جب غصہ بھڑک اٹھتا ہے۔ تو کسی ایک حد تک نہیں ٹھہرتا۔ اور جب اس کی عزت مجروح کی جائے۔ یا اس کے قبیلہ کی عزت پر کسی قسم کا حرف لایا جائے۔ تو اس کے غصہ کا ہیجان شدید ترین ہوتا ہے جب اس کا غیظ و غضب بھڑکتا ہے تو وہ تلوار کی طرف دوڑتا اور اسی سے اس کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت ایسی تھی کہ جنگوں نے انھیں فنا کر کے رکھ دیا تھا اور جنگ ان کا ایک لازمی نظام زندگی بن گئی تھی۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جنگ ہی دن رات ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی تھی۔

عادتاً عصبی مزاج کے لوگوں میں ذکاوت و فطانت کافی پائی جاتی ہے۔ اتفاق بھی یہی ہے کہ عرب لوگ بہت ذہین و فطین تھے۔ ان کی یہ ذکاوت ان کی زبان کے مطالعہ سے بھی بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کہ باریک سے باریک فرق اور بعید تر اشارات بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ ساتھ ہی ان کی ذکاوت کا مظاہرہ ان کی حاضر دماغی میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کی حاضر دماغی کا یہ عالم ہے کہ یکایک کوئی معاملہ پیش آجاتا ہے تو یکایک وہ اس کا بہترین جواب بھی دے دے گا۔ لیکن عربوں کی یہ ذکاوت خلق اختراع کی قسم کی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ہی مضمون کو مختلف قالبوں میں مختلف طریقوں پر ڈھالتا ہے۔ مضامین کی اختراع و تخلیق سے کہیں زیادہ ان کے بات کہنے کے مختلف انداز ہائے بیان تمہاری عقل کو محو حیرت کر دیں گے۔ اگر تم چاہو تو تم یوں کہہ سکتے ہو کہ ان کی زبانیں ان کی عقلوں سے کہیں زیادہ ماہر واقع ہوئی ہیں

اقبال اور قرآن
از پرویز
قیمت:- دو روپے

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید)

مشکل یہ ہے کہ میرے گردوپیش جو حلقہ ہے اور جو میرے پیغام کا مخاطب ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی زندگی میں کہیں حرکت کا نام و نشان تک نہیں اور میں ہمہ تن اضطراب ہوں۔

قلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش

ان کا سمندر بھی شبنم کی طرح ساکت و صامت۔ اور میری شبنم کا بھی یہ عالم کہ ہزار طوفانوں کو اپنے دل میں سموئے ہوئے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ احباب میرے اس پیغام سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے (بلکہ یوں سمجھئے کہ اس کا دوسرا گوشہ یہ ہے) کہ

نغمۂ من از جہانِ دیگر است ایں جرس را کاروانِ دیگر است

میرا نغمہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے۔ یہ میرے ان احباب کی دنیا کی چیز ہے ہی نہیں۔ میری جرس کسی اور قافلہ کے لئے بانگِ درا بن سکتی ہے۔ یہ زندگی اور حرکت سے محروم، کاروانِ خفتہ اس کی آواز رحیل سے کس طرح جادہ پیما ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ کچھ صرف میرے ساتھ ہی مختص نہیں۔

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

رخت باز از نیستی بیروں کشید چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید

کتنے ہی شاعر ایسے گزر چکے ہیں کہ ان کی "پیدائش" ان کی موت کے بعد ہوئی۔ انہوں نے ہماری آنکھ اس وقت کھولی جب اپنی آنکھ بند کر لی۔ جب وہ اس عالمِ موجود (دنیا) سے عالمِ عدم (موت) میں چلے گئے تو وہاں سے انہوں نے پھر اپنا رختِ سفر باندھا اور اپنے مزار کی خاک سے اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے جس طرح خاک میں پامال شدہ بیج سے پھول اُگ آتا ہے۔ یعنی جب تک وہ جیتے رہے نہ کسی نے ان کی بات سنی۔ نہ اس کا اثر قبول کیا۔ لیکن جب وہ اس دنیا سے چلے گئے تو لوگوں کو ہوش آیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کتنا بڑا پیغام دے گئے ہیں۔ اُس وقت انہوں نے اسے سمجھنا اور اس سے اثر پذیر ہونا شروع کیا۔ اس طرح گویا ان کی موت کے بعد ان کی اصل زندگی شروع ہوئی۔ یہ کچھ اس سے پہلے اوروں سے بھی ہو چکا ہے (جن میں غالبؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے) اور یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوگا۔ میں بھی غالبؔ کی ہمنوائی میں یہی کہوں گا کہ

قدرِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہ اس لئے ہے کہ انقلابی رستخیز دنیا کا معمول نہیں ہے۔ اس قسم کی حرکت اور حرارت جس میں ذہن، ندرتِ فکر و عمل کو بنظرِ تحسین دیکھنے کے لئے آمادہ ہوں، کبھی کبھی پیدا ہوا کرتی ہے۔ انقلابی دور گاہے ماہے آیا کرتے ہیں۔

کارواں ہا گرچہ زیں صحرا گذشت مثلِ گامِ ناقہ، کم غوغا گذشت

اس صحرائے دنیا میں ہزاروں قافلے آئے لیکن وہ اس طرح خاموشی سے آگے بڑھ گئے جس طرح ریت میں اونٹنی کا پاؤں بالکل بے آواز پڑتا اور اٹھتا ہے لیکن میری حالت ان سے جدا گانہ ہے۔

عاشقم فریاد ایمانِ من است شورِ حشر از پیش خیزانِ من است

میں تو عاشق ہوں اس لئے چپ رہنا میری فطرت کے خلاف ہے اور آہ و نالہ اور شیون و فریاد میرا ایمان ہے۔ اور آہ و نالہ بھی اس انداز کا کہ جسے تم شورِ حشر کہتے ہو وہ میرے خدمت گزاروں میں سے ہے۔

نغمہ ام زاندازۂ تار است بیش من نترسم از شکستِ عودِ خویش

میرے رگ و پے میں جو نغمہ پوشیدہ ہے، وہ میرے پیکرِ ہستی کے تاروں کے انداز سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ان تاروں میں سما ہی نہیں سکتا۔ وہ ان سے باہر آنے کے لئے بیتاب ہے۔ ایسا بے تاب اور اس قدر شدید کہ وہ ان تاروں کو توڑ کر باہر آجائے گا۔ اور مجھے اس کا قطعاً کوئی خوف نہیں کہ اس سے میرا بربطِ ہستی خود ٹوٹ جائے گا۔ یہ ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے۔ میں اس کی حفاظت کے لئے یہ تو کرنے سے رہا کہ اس نغمہ کو تاروں سے باہر نہ آنے دوں یا اگر اسے باہر لاؤں تو اس طرح پابندیاں عائد کرتا ہوا کہ اس سے مجھے کچھ ضعف نہ پہنچے۔ اس لئے کہ نغمہ ریزی تو میرا ایمان ہے اور ایمان کے مقابلہ میں جان کی کچھ حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ بنا بریں اگر یہ سوزِ دروں میرے پیکرِ ہستی کو پھونکتا ہے تو پھونک دے۔ میں اس کی خاطر اس آتشِ خاموش کو شعلۂ جوالہ بننے سے نہیں روک سکتا۔ اور جب اس باب میں مجھے خود اپنی زندگی کی پرواہ نہیں تو میں اس کی شدت میں اس لئے کمی کیوں کر دوں کہ دوسرے اس کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ جو کم ظرف اس کا متحمل نہیں ہو سکتا وہ اس کے پاس ہی کیوں آتا ہے۔

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

لہٰذا

قطرہ از سیلابِ من بیگانہ بہ قلزم از آشوبِ او دیوانہ بہ

میرے وفورِ شوق میں وہ اضطراب انگیزیاں نہاں ہیں کہ اس سے سمندر بھی اپنی تلاطم خیزیوں سے دیوانہ ہو جائے۔ یہ سیلاب اگر سمندر میں جا ملے تو اس میں دیوانگی پیدا کر دے۔ جس سیلاب کا یہ عالم ہو بچارے قطرۂ ناچیز کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اس سیلاب سے بیگانہ رہے۔ وہ اس کے جوش کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ میرا پیغام کم مایگاں کے لئے ہے ہی نہیں۔

در نمی گنجد بجو عمانِ من بحر ہا باید پئے طوفانِ من

میرا بحرِ عمان، ایک چھوٹی سی ندی کے اندر سما نہیں سکتا۔ ندی تو ایک طرف، اس کا طوفان سنبھالنے کے لئے ایک آدھ سمندر بھی کافی نہیں۔ اس کے لئے بہت سے سمندر چاہئیں۔ اسی لئے اقبالؔ کی دعا یہ تھی کہ

مے من از تنک جاماں نگہ دار
شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار
شرر از نیستانے دور تر بہ
بخاصاں بخش از عاماں نگہ دار

غالبؔ کے الفاظ میں ع

نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو!

علامہ اقبالؔ کے قرآنی پیغام سے متعلق
محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا
مجموعہ
اقبال اور قرآن
قیمت دو روپے
ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳۔ کراچی

عورت قرآن کا

(۱۴)

(۳) والذین کفروا لهم نار جهنم لا یقضی علیهم فیموتوا
ولا یخفف عنهم من عذابها کذلك نجزی كل كفور
وهم یصطرخون فیها ربنا اخرجنا نعمل صالحا غیر الذی
كنا نعمل اولم نعمركم ما یتذكر فیه من تذكر
وجاءكم النذیر فذوقوا فما للظالمین من نصیر ○

(فاطر رکوع ۴)

اور جو لوگ کفر و انکار کرتے ہیں ان کے لئے جہنم کی آگ ہے جہاں ان کو نہ تو موت ہی آئے گی کہ مرجائیں اور نہ وہ جہنم کا عذاب ہی اُن پر سے ہلکا کیا جائے گا۔ ہمارے قانون کے مطابق ہر کفر و انکار کرنے والے کو ایسے ہی نتائج پیش آیا کرتے ہیں اور وہ لوگ جہنم میں چلائیں گے کہ "اے ہمارے پروردگار! ہم کو اب نکال لے۔ ہم اب برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے، صلاحیت بخش کام کریں گے"۔ جواب ملے گا کہ "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر دی نہ تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ اس میں سمجھ سکتا؟ اور تمہارے پاس بدعملی اور انکار کے نتائج سے ڈرانے والے پیغمبر بھی تو پہنچے تھے۔ سو اب اعراض کا مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں۔

سأل سائل بعذاب واقع ○ للكافرين ليس له دافع ○ من
الله ذي المعارج ○ تعرج الملائكة والروح إليه في يوم
كان مقداره خمسين ألف سنة ○ فاصبر صبرا جميلا ○
إنهم يرونه بعيدا ○ ونراه قريبا ○ يوم تكون السماء
كالمهل ○ وتكون الجبال كالعهن ○ ولا يسأل حميم حميما ○
يبصرونهم يود المجرم لو يفتدي من عذاب يومئذ ببنيه ○
وصاحبته وأخيه ○ وفصيلته التي تؤويه ○ ومن في الأرض
جميعا ثم ينجيه ○ كلا إنها لظى ○ نزاعة للشوى ○ تدعو
من أدبر وتولى ○ وجمع فأوعى ○ إن الإنسان خلق
هلوعا ○ إذا مسه الشر جزوعا ○ وإذا مسه الخير منوعا ○
إلا المصلين ○ الذين هم على صلاتهم دائمون ○ والذين
في أموالهم حق معلوم ○ للسائل والمحروم ○ والذين
يصدقون بيوم الدين ○ والذين هم من عذاب ربهم
مشفقون ○ إن عذاب ربهم غير مأمون ○ والذين
هم لفروجهم حافظون ○ إلا على أزواجهم أو ما ملكت
أيمانهم فإنهم غير ملومين ○ فمن ابتغى وراء ذلك
فأولئك هم العادون ○ والذين هم لأماناتهم وعهدهم
راعون ○ والذين هم بشهاداتهم قائمون ○ والذين هم
على صلاتهم يحافظون ○ أولئك في جنات مكرمون ○

(معارج ۱ع)

"ایک سائل اس عذاب کی درخواست کرتا ہے جو کافروں پر واقع ہونے والا ہے؛ اور جس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں؛ اور جو اس اللہ کی طرف سے واقع ہوگا جو بڑی بلندیوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور الروح پچاس ہزار سال کے بقدر زمانہ (period) خدا کی طرف بلند ہوتے رہتے ہیں۔ سو اے پیغمبر! تم صبر کرو اور وہ صبر، صبر جمیل ہو۔ یہ لوگ اُس دن کو بہت دور سمجھ رہے ہیں۔ اور ہم اس کو بالکل ہی نزدیک دیکھ رہے ہیں جس دن آسمان تیل کے تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا۔ اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔ اور اس دن کوئی دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا۔ باوجودیکہ وہ ایک دوسرے کو دکھلا بھی دیئے جائیں گے۔ اس دن مجرم لوگ چاہیں گے کہ عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، بھائی کو بلکہ پورے اس کنبے کو جس میں وہ رہتا تھا، بلکہ تمام اہل زمین کو، اپنے فدیہ میں دیدے۔ مگر یہ ہوگا نہیں۔ اس کے لئے تو بس صرف آگ ہوگی۔ ایسی آگ جو لپک دیتی ہوگی۔ جو بدن سے ان کی کھال اتار دے گی جس نے میرے حکموں سے اعراض کیا ہوگا۔ جس نے مجھ سے بے رُخی کی ہوگی اور جس نے مال فراہم جمع کیا ہوگا پھر اس کو اٹھا اٹھا کر رکھا ہوگا (اور مفاد عامہ کے لئے اس کو کھلا نہیں چھوڑا ہوگا) واقعی انسان بڑا کم ہمت ہے جب تکلیف پہنچتی ہے تو گریہ وزاری کرنے لگتا ہے اور جب فارغ البالی ہوتی ہے تو پھر بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر ہاں وہ لوگ جو نظام صلوٰۃ کے پابند ہیں اور اپنی صلوٰۃ کو پابندی سے ہمیشہ ادا کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے ناموں میں ضرورت مند اور محروم لوگوں کا ایک مقررہ حصہ ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو مکافات عمل کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو خدا کے عذاب سے ڈرتے ہیں، واقعی ان کے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کی چیز؛ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے کہ جن کے بارے میں کوئی ملامت نہیں ہے، پھر جو ان کے علاوہ کا طلبگار رہو، تو یہی لوگ حد سے تجاوز ہو جانے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں، اور جو صحیح صحیح گواہیاں دیتے ہیں اور جو اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں ایسے لوگ بڑے اعزاز کے ساتھ باغات میں داخل کئے جائیں گے

---

(۱) وكل إنسان ألزمناه طائره في عنقه ونخرج له يوم القيامة
كتابا يلقاه منشورا ○ اقرأ كتابك كفى بنفسك اليوم
عليك حسيبا ○ من اهتدى فإنما يهتدي لنفسه ومن
ضل فإنما يضل عليها ولا تزر وازرة وزر أخرى
وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا (بنی اسرائیل رکوع ۲)

"اور ہم نے ہر انسان کا عمل، اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال اس کے واسطے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں گے جس کو وہ واضح طور پر دیکھ لے گا، کہ یہ اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے، آج تو خود اپنا آپ محاسب کافی ہے"۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ہدایت کے راستے پر چلتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے چلتا ہے۔ اور جو شخص بے راہروی اختیار کرتا ہے سو وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور اسی لئے ہم کسی قوم کو سزا بھی نہیں دیا کرتے جب تک اس میں ہم کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے ہیں۔

(۲) ولقد عهدنا إلى آدم من قبل فنسي ولم نجد له عزما
(طٰہٰ ع۶)

اور اس سے پہلے ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے سو اُن سے غفلت ہو گئی اور ہم نے اُن میں عزم کی پختگی نہ پائی۔

(۳) وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن (بقرہ رکوع ۱۵)

اور جب امتحان کیا ابراہیم کا اس کے پروردگار نے، چند باتوں میں، تو وہ پورا اُترا

نوادرات { علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا مجموعہ قیمت چار روپے

سب سے پہلے اور سب سے بڑے مفسّر

ابو جعفر محمّد بن جریر الطبری

(از علامہ تمنّا عمادی مدظلہٗ)

(۳)

ابن جریر کے پردادا ایک ترکیب تو ابن جریر جاننے کی اور بھی سوچی گئی تھی۔ وہ یہ کہ ابن جریر کے دادا جن کا نام رستم تھا۔ اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا اسلامی نام یزید رکھا گیا۔ تو فقط رستم اور یزید کا فرق دکھا کر دو ابن جریر پیدا کرتے سے ایک کے دو ہونے کا یقین دوسروں کو نہیں پیدا کرایا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ لوگ حقیقت حال سمجھ جاتے کہ رستم ہی کا اسلامی نام یزید تھا۔ رستم و یزید دو شخص نہ تھے بلکہ ایک ہی تھے۔ اور یہی اصل واقعہ بھی ہے۔ اس لئے یزید کے بعد بھی دو ایک اسلامی نام تصنیف کر دیئے جائیں۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یزید کوئی نو مسلم نہ تھا بلکہ اس کے اوپر کے لوگ بھی مسلمان تھے۔ اس پہلو پر محمد بن اسحٰق بن الندیم نے بھی غور کیا۔ اور دوسروں نے بھی غور کیا۔ مگر باہمی مشوروں سے ان پر غور نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے غور کرنے والوں کے نتیجہ غور میں اختلاف ہو کر رہا۔ ابن اسحٰق ندیم نے یزید کے باپ کا نام خالد تجویز کر کے اپنی کتاب الفہرست میں ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد الطبری لکھا۔ مگر ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ نجاشی وغیرہ نے بھی اس پہلو پر غور کیا تھا۔ اور ابن جریر کے پردادا ہی نہیں سرپردادا کا نام بھی تصنیف کر رکھا ہے۔ اور انھوں نے ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب لکھا ہے۔ جیسا کہ شیخ عبداللہ المامقانی نے تنقیح المقال میں اس کو نقل کیا ہے اور پھر ندیم نے جو اپنی فہرست میں یزید بن خالد لکھا ہے۔ اس کو بھی نقل کر دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ابن اسحٰق ندیم نے ابن جریر بن یزید بن خالد جو لکھا ہے۔ وہ ابن جریر بن یزید کے خلیفہ ارشد ابو الفرج المعافا بن زکریا والنہروانی کی روایت سے لکھا ہے۔ محمد بن اسحٰق الندیم کا سال ولادت تو معلوم نہ ہو سکا مگر انھوں نے اپنی کتاب الفہرست میں ایک جگہ ۳۷۷ھ میں لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان ج ۵ ص ۷۲ میں لکھا ہے اور معافا بن زکریا النہروانی ابن جریر مفسر متوفی ۳۱۰ھ کے پیرو ضرور تھے۔ مگر ان کی وفات ۳۹۰ھ میں ہوئی (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰) یعنی ابن جریر کی وفات کے پورے اسی برس کے بعد۔ یقین ہے کہ انھوں نے ابن جریر کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ اور یہ خود بھی متشیع ہی تھے۔ اسی لئے انھوں نے خود بھی وضو میں مسح رجلین کی فرضیت پر ایک کتاب لکھی تھی (جس کی بنیاد صرف کوفی شیعوں کی من گھڑت روایتوں ہی پر تھی) اس لئے یوں بھی ان کی روایت مشتبہ ہے پھر جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ معافا کو یہ کس سے معلوم ہوا کہ ابن جریر کے پردادا کا نام خالد تھا۔ اس وقت تک صرف ابن ندیم کا لکھ دینا ہرگز قابل وثوق نہیں۔ ابن ندیم کا سال ولادت و وفات معلوم نہیں مگر ابن حجر لسان المیزان میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب "الفہرست" میں ایک جگہ ۳۷۷ھ کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اس طرح جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت الفہرست لکھ رہے تھے، مگر بقول ذہبی یہ ۳۷۷ھ سے فہرست لکھ رہے تھے۔ معافا بن زکریا سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے باہمی مشورے سے ابن جریر کے پردادا کا نام خالد تصنیف کیا ہو۔ اور ابن یزید بن کثیر بن غالب: تو اس کے من گھڑت ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کی کوئی سند ہی اس کے لکھنے والوں میں سے کسی نے نہیں پیش کی ہے کہ یہ کس ذریعے سے معلوم ہوا اور بالفرض ایسا ہو بھی تو ممکن ہے رستم کمسن ہوں اور ان کے باپ جوان ہوں اور ان کے دادا بوڑھے ہوں، اور تینوں نے ساتھ ساتھ اسلام قبول کیا ہو۔ رستم کا نام یزید رکھا گیا۔ رستم کے باپ کا نام کثیر اور کثیر کے باپ کا نام غالب رکھا گیا ہو، اس لئے اس سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یزید ہی رستم نہ تھے۔ اگر یزید کے باپ کا نام کثیر اور دادا کا نام غالب تھا جب بھی ہو سکتا ہے کہ یزید کا پہلا نام رستم ہی ہو۔ اور اسلامی نام یزید رکھا گیا ہو۔ اور کثیر و غالب کے نام بھی پہلے کچھ اور ہوں اور یہ اسلامی نام ہوں۔ شاید کثیر کا نام زال ہو اور غالب کا جاہلی نام سام ہو۔ جیسی کہ پوتے کا نام رستم تھا۔

ایک نیا شگوفہ عبداللہ المامقانی نے ایک نئی بات سوچ کر یہ نکالی کہ ممکن ہے کہ ابن جریر مفسر کی ماں بنی جریر سے ہوں۔ یعنی ابو جعفر جو ابن جریر کہے جاتے ہیں۔ وہ ننہالی تعلق کی وجہ سے ہو۔ جریر کے یہ بیٹے نہ ہوں بلکہ نواسے ہوں۔ کیونکہ یہ آمل کے رہنے والے جب تھے تو آمل تو خاص شیعوں کا مرکز تھا۔ ان کو بھی شیعہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ ان کا مولد آمل ہی میں ہے یہ شیعہ نہیں ہیں، کیونکہ نجاشی، طوسی، بہاء الدین عاملی وغیرہم اکابر محدثین شیعہ ان کو سنی ہی کہتے آئے ہیں۔ اور سنی علمائے رجال بھی سنی ہی کہتے ہیں۔ صرف ہلکا پھلکا شیعہ لکھتے ہیں۔ اور آمل کا رہنے والا ہلکا پھلکا شیعہ کیوں ہونے لگا۔ اس کو تو بھاری بھرکم شیعہ ہونا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آمل میں ابن جریر بن یزید کی صرف ننہال تھی۔ مگر یہ ددھیال کے اثر سے سنی بنے رہے؛ جب یہاں تک بات بنا سکتے تھے تو علامہ مامقانی کو لازم تھا کہ ان کی ایک ددھیال بھی تصنیف فرما دیتے۔ اور پھر باپ کا نام بھی کوئی گھڑ دیتے۔ کیونکہ اب تو وہ یزید و کثیر و غالب سب کے سب اجداد فاسدہ ہی میں داخل ہو گئے۔ یہ پہلی مثال مامقانی صاحب نے پیدا کی ہے کہ ایک اتنا بڑا مشہور و معروف امام تفسیر و تاریخ صرف اپنے ننہالی ہی اجداد فاسدہ کی طرف منسوب ہو کر کئی پشت تک متعارف ہو۔ اور اس کے باپ دادا پردادا کا کوئی ذکر اس کے نام کے ساتھ نہ کیا جائے اور نہ کسی کو اس کے باپ، دادا، پردادا کا نام معلوم ہو۔

ایک نئی زبردست شہادت معجم البلدان ج ۱ ص ۶۳ میں شہر آمل کا ذکر کرتے ہوئے یاقوت حموی صاحب معجم نے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا مولد آمل ہی میں تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اسی لئے ابو بکر محمد بن العباس الخوارزمی نے کہا ہے جو آملی الاصل تھے (جن کی وفات کتاب مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۱۶ میں ۳۸۳ھ میں لکھی ہے اور ۷۰ برس کی عمر پائی تھی۔ یہ ابن جریر کے شاگرد بھی تھے)

بآمل مولدی وبنو جریر	فاخوالی ویحکی المرءُ خالہ
فہا انا رافضیٌّ عن تراثٍ	وغیری رافضی عن کلالہ

یعنی

آمل میں میرا مولد ہے اور جریر کے بیٹے	میرے ماموں ہیں اور ہر شخص ماموں کے مشابہ ہوتا ہے
تو سن رکھو کہ میں وراثۃً رافضی ہوں	اور میرے سوا جو رافضی ہے کلالۃً یعنی دور کے لگاؤ سے رافضی ہے

اس کے بعد یاقوت حموی صاحب معجم البلدان نے فرمایا کہ وہ جھوٹا تھا۔ ابن جریر ہرگز رافضی نہ تھے گرچہ حنبلیوں نے ان کے ساتھ حسد کر کے ان کو رافضی مشہور کر دیا۔ اس اتہام کو اس خوارزمی نے غنیمت سمجھا اور لگا اس پر فخر کرنے حقیقت یہ ہے کہ وہ خود رافضی بد زبان و بد کلام تھا۔"

یاقوت حموی صاحب کی پیدائش کا سال تو معلوم نہیں۔ مگر سال وفات ۶۲۶ھ ہے۔ ابن جریر کا وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ یعنی حموی کی وفات سے ۳۱۶ برس پہلے، اور محمد بن العباس الخوارزمی ابن جریر کا خود بھانجا ہے اور شاگرد بھی۔ وہ اپنے ماموں اور استاد کے عقیدہ و مذہب سے حموی سے زیادہ واقف ہو سکتا ہے، یاقوت حموی جو ۳۱۶ برس کا فاصلہ ابن جریر سے رکھتے ہیں۔ جن کو ابن جریر سے دور کا بھی کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ کیا حق رکھتے ہیں کہ ابن جریر کے بھانجے کو ابن جریر کے حالات بیان کرنے میں جھوٹا کہیں۔ خصوصاً جب وہ بھانجا بھی ہو اور شاگرد بھی ہو۔

اسی طرح علامہ حافظ ابو حیان محمد بن یوسف کی ولادت ۶۵۴ھ اور وفات ۷۴۵ھ میں ہے یہ ابن حجر کے شیخ الشیوخ تھے۔ اور ابن حجر کی ولادت ۷۷۳ھ میں اور وفات ۸۵۲ھ میں تھی۔ اس لئے ابن حجر کے شیخ الشیوخ نے جو ابن جریر کے متعلق اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "امام من ائمۃ الامامیۃ" یعنی یہ مذہب امامیہ کے اماموں میں سے ایک امام تھے۔ تو بلاوجہ محض حنبلیوں کے پروپاگنڈے سے متاثر ہو کر یا علامہ سلیمانی کے مغالطے میں آ کر نہیں لکھ گئے تھے۔ بلکہ علی وجہ البصیرت انھوں نے لکھا تھا۔ ابن حجر کو کوئی حق نہ تھا کہ اپنے شیخ الشیوخ پر غلط فہمی وغیرہ کا الزام دیں۔

اور اسی طرح علامہ سلیمانی حافظ احمد بن علی کی ولادت ۳۲۱ھ میں اور وفات ۴۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی ابن جریر کی وفات کے صرف گیارہ برس کے بعد یہ پیدا ہوئے تھے۔ سلیمانی کے والد نے تو یقیناً ابن جریر کا کافی زمانہ پایا ہوگا۔ ابن جریر کے کتنے تلامذہ کو علامہ سلیمانی نے دیکھا ہوگا۔ بلکہ ان سے ملے ہوں گے۔ اور ابن جریر کے حالات سنے ہوں گے۔ علامہ سلیمانی میں ابن جریر سے معاصرت بھی نہ تھی کہ معاصرانہ چشمک ان کے ساتھ رکھتے ہوں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ علامہ سلیمانی

کی متفقہ رائے کو کسی غلط فہمی کا نتیجہ کہا جائے، خصوصاً جب ان کی رائے کی تصدیق خود ابن جریر کا سچا نچا کردار ہو اور پھر ابن جریر کی تصنیفات سے بھی ہو رہی ہو۔

مگر ذہبی جن کی ولادت ۶۷۳ھ میں اور وفات ۷۴۸ھ میں ہوئی۔ یعنی ابن جریر کی وفات کے تین سو تریسٹھ برس کے بعد جو پیدا ہوئے تھے۔ اور ابن حجر جن کی ولادت ۷۷۳ھ اور وفات ۸۵۲ھ میں ہوئی۔ یعنی جو ابن جریر کے وفات کے چار سو تریسٹھ برس کے بعد پیدا ہوئے تھے علامہ سلیمانی کی شہادت صادقہ اپنے شیخ الشیوخ حافظ ابن حبان کی شہادت واضحہ اور پھر خود ابن جریر کے بھانجے کی زبردست گواہی، سب کو بلا دلیل ٹھکرا دیتے ہیں اور اپنی روایت پرستی کی کھوکھلی دیوار پر غلط حسن ظن کا پشتہ لگائے رہتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ خود ابن جریر کے ذاتی حالات جن کا ذکر یہ لوگ خود کرتے ہیں۔ ان کے حسن ظن کے پشتے پر کلہاڑیاں چلائے جا رہے ہیں۔ یعنی ابن جریر کے حمایت کرنے والے ائمہ رجال خود ان باتوں کا اعتراف کر رہے ہیں کہ

۱۔ وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کے ابن جریر قائل تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔

۲۔ طلاق کا فتویٰ شیعہ مذہب کے مطابق انھوں نے دیا تھا۔

۳۔ خم غدیر والی حدیث (جو شیعوں کی من گھڑت ہے) اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔

۴۔ امامت کے منصوص من اللہ ہونے کا عقیدہ خاص شیعوں کا ہے۔ اسی عقیدے پر مذہب امامیہ کی بنیاد ہے۔

ابن جریر نے اس (خلاف قرآن) عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مسترشد نام کی ایک کتاب لکھی تھی۔

یہ چاروں باتیں ایسی ہیں جن کا اعتراف فریقین کے متعدد ائمہ رجال کو ہے۔ اور ان میں سے ہر بات ایسی ہے جو ان تین شہادتوں کے ساتھ جو علامہ سلیمانی، شیخ الشیوخ حافظ ابن حبان اور ابن جریر کے بھانجے محمد بن العباس الخوارزمی نے دیں، ابن جریر کو شیعہ امامیہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ چہ جائیکہ ان تین شہادتوں کے ساتھ ساتھ وہ چاروں باتیں جب پائی جا رہی ہوں تو پھر ابن جریر کے شیعہ امامیہ ہونے میں کون سی کسر باقی رہ جاتی ہے؟

چونکہ اس وقت ابن جریر پر کوئی مستقل مضمون نہیں لکھ رہا ہوں۔ اور جتنا لکھ گیا ہوں وہی بہت طول ہو گیا۔ اور اہل انصاف کے لئے اتنی تفصیل ابن جریر کے شیعہ تسلیم کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اب اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگرچہ میرے پاس ابھی ابن جریر کے متعلق اور بھی کچھ باتیں ہیں جنھیں میں پیش کر سکتا ہوں۔

ایک شبہے کا ازالہ

البتہ ایک دوست نے مدت ہوئی یہ لکھا تھا کہ ابن جریر کی توثیق سلف سے خلف تک تمام اکابر اہل سنت کرتے رہے صرف علامہ سلیمانی و شیخ الشیوخ حافظ ابن حبان کی جرح تمام اکابر اہل سنت کے مقابلے میں قابل تسلیم نہیں۔ اس کے متعلق میں نے اسی وقت لکھا تھا جس کو یہاں بھی نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مگر اختصاراً

ابن جریر کی توثیق ان کے ہم عصر ائمہ حدیث میں سے یا ان کے کچھ بعد والے اکابر محدثین میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ صحاح ستہ کے جامعین سب کے سب ان کے معاصر تھے۔ امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی وفات کے وقت ابن جریر ۳۲ برس کے تھے۔ امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ کے وفات کے وقت ابن جریر ۳۷ برس کے تھے۔ ابو عبد اللہ بن ماجہ القزوینی متوفی ۲۷۳ھ کی وفات کے وقت وہ ۴۹ برس کے تھے۔ ابو داؤد سلیمان بن الاشعث متوفی ۲۷۵ھ کی وفات کے وقت ۵۱ برس کے تھے۔ اور محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ کی وفات کے وقت ۵۵ برس کے تھے اور ابو عبد الرحمن بن اشعث النسائی متوفی ۳۰۳ھ کی وفات کے وقت تو ۷۹ برس کے تھے۔ کیا ان اکابر محدثین میں سے کسی نے ان کو صرف "ثقة" بھی لکھا! "یکتب حدیثه" بھی کسی نے لکھا؟

اب رہے خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ و مولدہ ۳۹۲ھ سو انھوں نے نہ ابن جریر کو دیکھا نہ ابن جریر کے شاگردوں کو دیکھا۔ صرف ابن جریر کی تصنیفات دیکھ کر اگر ابن جریر کو بہت بڑا عالم، ماہر اختلافات، قرآت، واقف ناسخ و منسوخ اور حافظ احادیث وغیرہ لکھا۔ تو صحیح لکھا ان باتوں سے تو کسی کو بھی انکار نہیں مگر ان کے بہت بڑے عالم، بہت بڑے ادیب، اور بہت بڑے مورخ و حافظ احادیث وغیرہ ہونے سے ان کی ثقاہت کہاں سے ثابت ہو گئی۔ خطیب نے ان کو حجت و سند اور ثقہ و ثبت وغیرہ تو لکھا نہیں۔ اس لئے خطیب بغدادی کی تحریر سے ابن جریر سند و حجت اور ثقہ و ثبت نہیں ثابت ہو سکتے۔

باقی رہا ابن خالویہ حسین بن احمد کا یہ کہنا کہ مجھ سے ابن خزیمہ[1] نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے تفسیر ابن جریر لکھی ہے! تو میں نے کہا کہ ہاں میں نے ابن جریر سے املاء لکھی ہے (یعنی وہ بتاتے گئے اور میں لکھتا گیا) سات برس میں اس کی تکمیل کی تو مجھ سے ابن خزیمہ نے وہ تفسیر مستعار لی اور کئی سال بعد واپس کی اور کہا کہ میں نے اول سے آخر تک دیکھی۔ روئے زمین پر ابن جریر سے بڑا عالم میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ اور حنابلہ نے بے شک ان پر ظلم کیا (یہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ حنبلیوں نے ابن جریر کو شیعہ اور گمراہ اور کذاب مشہور کر رکھا تھا اور دوسروں کو ابن جریر سے ملنے سے منع کرتے تھے۔ واللہ اعلم)

تو یہ روایت ابن خالویہ حسین بن احمد سے ہے اور ابن خالویہ کے متعلق خود ابن حجر لسان المیزان ج ۲ ص ۲۶۷ میں لکھتے ہیں کان اماميا عالما بالمذهب .... وقد قرأ ابو الحسين النصيبي وهو من الامامية عليه كتابه في الامامة یعنی ابن خالویہ شیعہ امامیہ تھے اس مذہب کے عالم تھے اور ابو الحسین النصیبی نے جو شیعہ امامیہ تھے ان سے ان کی وہ کتاب پڑھی تھی جس کو انھوں نے مسئلہ امامت پر لکھا تھا۔ ۳۷۰ھ یا ۳۷۱ھ میں وفات پائی۔ اس لئے اگر ابن خالویہ شیعہ نے ابن جریر شیعہ کی حمایت میں ایک روایت ابن خزیمہ[1] کی طرف جھوٹی منسوب کر دی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ شیعہ راویوں کا تو یہ ہمیشہ معمول رہا ہے۔

ابن خالویہ شیعہ کے ایک استاد ابو بکر بن مجاہد جو ایک مشہور قاری تھے۔ ان کے متعلق جو ابو علی الطوماری سے ایک روایت ابن حجر نے لکھی ہے کہ ابو بکر بن مجاہد نے کہا کہ "میرا ایمان ہے کہ اس قرآت سے قرآن پڑھنے والا اللہ نے ابن جریر سے اچھا نہیں پیدا کیا"۔ تو یہ بھی ابن جریر کی توثیق نہیں ہوئی۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ ابن جریر کی خود ساختہ من گھڑت جو خاص قرآت تھی۔ اس کے مطابق کوئی دوسرا قرآن کا پڑھنے والا ان سے اچھا نہ ہوگا۔ اور نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہی تو اپنی خاص قرآت کے مصنف تھے اور ع تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ جو قرآت خاص ابن جریر کی تصنیف تھی۔ اس کو بے شک ابن جریر دوسروں سے بہتر ہی ادا کرتے ہوں گے۔

مگر اس روایت کے راوی ابو علی الطوماری ہیں۔ جن کے متعلق کسی نے یہ تو نہیں لکھا ہے کہ شیعہ تھے۔ مگر انداز ان کے شیعہ راویوں کی طرح ضرور تھے۔ خود ابن حجر لسان المیزان ج ۲ ص ۲۴۴ میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ائمہ رجال ...... نے ان کے متعلق کلام کیا ہے۔ چونکہ یہ بغیر کسی اصل کے روایت کیا کرتے تھے۔ مگر ابن حجر نے ان کی بے اصل روایتوں کی کوئی مثال نہیں پیش کی۔ میں نے اس کی ایک مثال پیش کر کے ابن حجر کی تصدیق کئے دیتا ہوں۔ کہ یہ طوماری بشر بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ مگر دنیائے رجال میں بشر بن موسیٰ کوئی بھی نہیں ہے۔ البتہ بشار بن موسیٰ ضرور تھے۔ مگر وہ نہایت مجروح تھے۔ اس لئے ان سے روایت کرنے والے ہمیشہ ان کا نام چھپانے کے لئے ان کو بشر بن موسیٰ ہی کہتے اور لکھتے رہے۔ تو اگر یہ دیکھ کر کہ امام احمد بن حنبل و ابو حاتم الرازی و ابو القاسم البغوی جیسے اکابر محدثین ان سے روایت کرتے ہیں اور سب ان کو "بشر بن موسیٰ" ہی کہتے ہیں۔ غریب طوماری نے بھی ان سے روایت کرنی شروع کر دی۔ "بشر بن موسیٰ" ہی کہہ کر تو ابو علی طوماری پر کوئی الزام نہیں۔ یہ وہ حمام ہے جس میں سب ننگے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ "بشار بن موسیٰ" جن کو بشر بن موسیٰ کہتے ہیں ان کی وفات ۲۲۸ھ میں ہے۔ اور ابو علی طوماری کی ولادت بقول ابن حجر ۲۶۰ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی "بشر بن موسیٰ" کی وفات کے ۳۲ برس کے بعد یہ مشکل کسی طرح آسان ہوتی نظر نہیں آتی۔ بیچارے طوماری کو معلوم نہ تھا کہ بشر بن موسیٰ ان کی ولادت سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ دیکھا کہ میرے بعض ہم عصر ان سے روایت کر رہے ہیں۔ تو انھوں نے بھی کچھ حدیثیں ان کی طرف منسوب کر کے روایت کر دیں۔ بس انھیں طوماری صاحب کا ابو بکر بن مجاہد کا وہ قول مروی ہے۔ اگر صحیح مانئے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ابن مجاہد نے طنزیہ انداز میں کہہ دیا ہوگا۔ ابن جریر کی مخصوص قرآت کی طرف اشارہ کر کے کہ اس

---

[1] ابو بکر محمد اسحٰق بن خزیمہ کی ولادت ۲۲۳ھ میں ہوئی تھی یعنی ابن خزیمہ ابن جریر سے ایک برس بڑے تھے اور ابن خزیمہ کی وفات ۳۱۱ھ میں یعنی ابن جریر کی وفات کے ایک برس بعد ہوئی۔ اور ابن خالویہ کی وفات ۳۷۰ھ میں ہے۔ ولادت کا سال اور عمر معلوم نہیں۔ ابن خزیمہ نیشاپوری تھے۔ اس لئے یہ بھی عجمی ہی تھے۔ اگر یہ ابن جریر کو ثقہ و حجت سمجھتے۔ تو ضرور ابن جریر سے حدیثیں سنتے۔ دونوں ہم سن ہی تھے۔ اور ابن خالویہ ہمدانی و حنبلی سے زیادہ ابن خزیمہ کو ابن جریر سے ملنے ملانے کے مواقع حاصل۔

قرأت سے تو قرآن کا پڑھنے والا ابن جریر سے اچھا اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ بجوبی ممکن ہے کہ یہ بھی طوماری کے طومار کذب و افترا میں سے ایک ہو۔ مگر اس سے بھی تو ابن جریر ثقہ و ثبت اور سند و حجت نہیں ثابت ہوتے۔

غرض شیعہ حضرات نے یا بعض مجروح و مشتبہ اشخاص نے ابن جریر کی کچھ محض معمولی سی تعریف کردی۔ تو اس سے وہ ثقہ و حجت و سند نہیں ثابت ہو سکتے۔ اور نہ علم و فضل و وسعت علم و مہارت ادب و تاریخ سے وہ حجت و سند ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں بحث ابن جریر کے علم و فضل و مہارت ادب و تاریخ سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کی دیانت و امانت اور ان کی صداقت و ثاقت یہاں زیر بحث ہے۔ اور اس کے متعلق علامہ حافظ سلیمانی و شیخ الشیوخ ابن حبان اور خود ابن جریر کے بھانجے اور شاگرد محمد بن العباس الخوارزمی کی شہادت کے مقابل ذہبی و ابن حجر یا ان کے جیسے متاخر محدثین کے بلا دلیل غلو بغیر الحق کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی جا سکتی اور حافظ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ، ان کا ترجمہ ان کے ہم عصر اور بعد والے ائمۂ نقل نے لکھا ہے کسی نے بھی ان کو نقص سے متصف نہیں کیا: بالکل خلاف واقعہ ہے۔ ابن جریر نے ان کے کسی ہمعصر کی تحریر نہیں پیش کی۔ ائمہ صحاح ستہ میں سے کسی کا قول نہیں لکھا۔ لے دے کر ابن خزیمہ کا قول پیش کیا۔ تو ایک شیعہ ہی کی روایت سے۔ ابن عساکر ہرگز ان کے ہم عصر نہ تھے۔ ان کا بھانجا ضرور ہم عصر تھا۔ واہل البیت ادری بما فیہ۔

اور سب سے زیادہ مکمل تصدیق حافظ سلیمانی و شیخ ابن حبان کی ابن جریر کی تفسیر اور تاریخ ہی سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ بشرطیکہ غلو و تعصب کی عینک اتار کر ان کتابوں کو دیکھا جائے۔ اور خلفائے راشدین کی تعریف اور ان کے فضائل کی حدیثیں جو ان میں کچھ مروی ہیں۔ ان سے دھوکا نہ کھایا جائے کہ یہ کتاب زمانہ اجمال کی تصنیفیں ہیں جب کہ شیعوں نے اپنے فرقہ کو اہل سنت سے علانیہ طور پر بالکل الگ نہیں کر لیا تھا۔ اس وقت شیعے تقیہ و کتمان کا برقعہ اوڑھے رہتے تھے۔ اور اپنے تشیع کو چھپانے کے لئے حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما ہی نہیں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی فضائل و مناقب اہل سنت کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اس لئے اہل سنت محدثین ان کو بے تعصب اور سچا سمجھ کر ان کی دو من گھڑت حدیثیں بھی قبول کر لیتے تھے۔ جن کے شہد میں زہر ملا ہوا ہوتا تھا۔ اور وہ حسن ظن کی وجہ سے اس شہد کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے تھے۔

غرض یہی ابن جریر طبری ہیں۔ جن کی تفسیر ہماری تمام مفسرین کا ماخذ ہے۔ اس لئے ہماری تفسیروں میں اگر قرآنی آیات کے سیاق و سباق کے خلاف بھی بعض باتیں نظر آئیں۔ تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب تفسیری حدیثوں کے راوی زیادہ تر ایسے ہی اشخاص ہیں۔ جن کے کذب و افترا، کا اعتراف خود محدثین کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ج ۲ صفحہ ۱۲۴ ترجمہ جویبر بن سعید البلخی الکوفی میں لکھتے ہیں۔

قال ابو قدامۃ السرخسی قال یحیی القطان تساھلوا فی اخذ التفسیر عن قوم لا یوثقونھم فی الحدیث ثم ذکر الضحاک وجویبرا ومحمد بن السائب وقال ھؤلاء لا یحمل حدیثھم ویکتب التفسیر عنھم یعنی ابو قدامہ سرخسی نے کہا کہ یحییٰ بن سعید القطان (امام فن رجال وحدیث) نے کہا کہ لوگوں نے تفسیری روایتیں قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا کہ ایسی جماعت سے تفسیری روایتیں لیتے ہیں جن کو حدیثوں کے قبول کرنے کے وقت قابل وثوق نہیں سمجھتے تھے۔ پھر انھوں نے ذکر کیا کہ ضحاک بن مزاحم، جویبر بن سعید اور محمد بن السائب الکلبی کا۔ اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدیثیں برداشت نہیں کی جاتیں۔ مگر ان کی تفسیری روایتیں لکھ لی جاتی ہیں۔ یہ جویبر بن سعید الکوفی وہ ہیں جن کے متعلق ابن حجر فن رجال وحدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں کہ یہ گئی گذری حدیثوں والے تھے۔ غیر ثقہ تھے۔ الٹی پلٹی حدیثیں روایت کرتے تھے۔ متروک الحدیث تھے وغیرہ ذالک۔ ۱۴۰ھ اور ۱۵۰ھ کے درمیان دنیا سے سدھارے۔

ضحاک بن مزاحم الخراسانی الکوفی۔ یہ کوفیوں کے سوا اور کسی سے کچھ روایت نہیں کرتے تھے الا ماشاء اللہ۔ البتہ متعدد صحابہؓ سے بلا واسطہ روایت کرتے تھے۔ حالانکہ کسی صحابی کو کبھی دیکھا تک نہ تھا حضرت عبداللہ بن عباس سے تفسیری حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ کوئی واقفکار پوچھتا تھا کہ تم نے یہ حدیثیں ابن عباس سے خود سنی ہیں؟ تو کہتے تھے نہیں۔ بلکہ ہم نے فلاں فلاں سے سنیں مگر اپنے کوئی نام لیتے، ابو جناب الکلبی الکوفی جیسوں سے کہتے تھے کہ میں ابن عباس کے ساتھ سات برس تک رہا ہوں۔ ۱۰۵ھ میں ان کی وفات ہے۔

محمد بن السائب الکلبی الکوفی۔ ان کے اوصاف جمیلہ کا کیا پوچھنا ہے۔ بہت مشہور معروف

بزرگ تھے مختصر یہ کہ شیعہ تھے۔ اور بالکل ہی متروک الحدیث تھے۔ مگر ان کی تفسیری روایتوں سے تفسیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

یہی تین نہیں بلکہ ایک جماعت اسی طرح کی آپ کو ملے گی۔ تفسیری روایات کے راویوں کے حالات میں میری ایک مستقل کتاب ہے۔ جس کا نام ہے اسفار المسفرین فی تراجم المفسرین جس میں کم و بیش دو سو راویان روایت تفسیر کے حالات مذکور ہیں۔ ان میں سے تین کے حالات تو آپ کو معلوم ہو چکے تین چار کے حالات اور بھی سن لیجئے۔

اسمٰعیل بن عبدالرحمن بن ابی کریمہ السُّدی الکوفی یہ قریشی خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ تفسیری روایتیں ان سے بہت مروی ہیں۔ امام شعبی کے سامنے کسی نے کہا کہ سُدی کو علم قرآن کا ایک بڑا حصہ ملا ہے۔ تو شعبی نے فرمایا کہ سُدی کو جہل از قرآن کا بہت بڑا حصہ ملا ہے۔ امام رجال وحدیث جوزجانی نے ان کو کذاب اور اسلاف کو گالیاں دینے والا کہا ہے۔ لیث بن ابی سلیم نے کہا کہ کوفے میں دو مشہور کذاب ہیں۔ جن میں سے ایک تو مر گیا۔ اور ایک ابھی زندہ ہے اور کلبی و سُدی کا نام لیا یہ حضرت صدیق اکبر و حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی شان میں گستاخیاں کرتا تھا۔ امام احمد نے فرمایا کہ یہ جو تفسیر بیان کرتا ہے۔ ان کے لئے سلسلہ اسناد خود بنا لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اول درجے کا کذاب تھا۔ ۱۲۷ھ میں اس کو وفات ہوئی۔ مگر محدثین کے اس اعتراف کے باوجود آپ تفسیری روایتیں اسی فیصدی ضحاک اور سُدی یا کلبی ہی سے پائیں گے۔

بعض راویان تفسیر بذات خود ثقہ سمجھے گئے ہیں۔ مگر ان سے روایت کرنے والے مجروح ہیں مگر مفسرین ان تفسیروں کو انھیں ثقہ لوگوں کے نام سے لکھتے ہیں۔ اور جو مجروحین ان سے روایت کرتے ہیں۔ جن سے ان مفسرین کو وہ تفسیر ملی ان کا ذکر نہیں کرتے مثلاً محمد بن کعب القرظی کہ اگرچہ یہ آزاد کردہ غلام تھے ان کے باپ یہودی قریظہ میں سے تھے۔ جو قیدیوں میں آئے تھے۔ مگر ان کو محدثین نے ثقہ و حجت لکھا ہے۔ اور ان پر کسی نے کوئی جرح نہیں کی ہے۔ ان سے بھی تفسیری روایتیں بہت ہیں مگر ان سے جو لوگ روایت کرتے ہیں۔ ان میں اکثریت مجروحین کی ہے جیسے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف ان کا مفصل ترجمہ تہذیب التہذیب ج ۸ صفحہ ۴۲۳ میں دیکھئے۔ منکر الحدیث، ضعیف الحدیث، غیر ثقہ لیس بشیء احد الکذابین۔ احد ارکان الکذب۔ رجل بطال متروک الحدیث وغیرہ سب لکھا ہے۔ محمد بن کعب القرظی سے یہ بہت زیادہ روایت کیا کرتے تھے۔ یعنی تفسیریں گھڑتے تھے۔ اور ان کی طرف منسوب کرکے روایت کیا کرتے تھے۔

موسیٰ بن عبیدہ بن نشیط الربذی[2] ان کا بھی مفصل حال تہذیب التہذیب ج ۱۰ صفحہ ۳۵۶ سے صفحہ ۳۶۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کو لوگ "مدنی" لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ "ربذہ" کے رہنے والے تھے اور وہیں مرے۔ وہیں مدفون ہوئے۔ بہت دنوں تک کوفے میں بھی آکر رہے تھے۔ "ربذہ" ایک بستی تھی مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلے پر مکہ معظمہ کے راستے پر۔ امام احمد بن حنبل نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ ان سے کسی حدیث کا روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ تو کسی نے کہا کہ امام شعبہ نے تو ان سے روایت کی ہے۔ تو امام احمد نے فرمایا کہ ان کی جو باتیں دوسروں پر ظاہر ہو گئی ہیں اگر شعبہ پر بھی ظاہر ہو جاتیں۔ تو وہ کبھی ان سے روایت نہیں کرتے۔ امام احمد بن حنبل نے یہ بھی کہا کہ چار شخصوں کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔ موسیٰ بن عبیدہ، اسحٰق بن ابی فروہ، جویبر بن سعید اور عبدالرحمن بن زیاد امام بخاری نے موسیٰ بن عبیدہ کو "منکر الحدیث" لکھا ہے۔ اثرم نے کہا کہ ان کی حدیثیں جو عبداللہ بن دینار سے مروی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور ہی عبداللہ بن دینار ہیں۔ اور پھر کسی نے لیس بشیء کسی نے اضرب علی حدیثہ کسی نے منکر الحدیث کسی نے لا یحتج بحدیثہ کسی نے غیر ثقہ اور کسی نے لا یحدث عنہ وغیرہ بہت کچھ کہا ہے۔ ۱۵۳ھ میں مرے۔ یہ بھی محمد بن کعب القرظی سے روایت کرتے ہیں۔

ہشام بن زیاد بن ابی زید ابو المقدام حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھے لکھا یہی ہے۔ مگر غالباً آل عثمان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ بہر حال یہ محمد بن کعب القرظی سے تفسیری حدیثیں بہت روایت کرتے تھے۔ ائمہ رجال وحدیث میں سے ان کو کسی نے ضعیف کسی نے لا یحتج بحدیثہ وغیرہ لکھا ہے۔ اور ابن حبان نے کھل کر لکھ دیا کہ یروی الموضوعات عن الثقات لا یجوز الاحتجاج بہ یہ ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ ان کی سند لینا جائز نہیں ہے۔ ان کا سال وفات وغیرہ مذکور نہیں۔

اسی طرح مجاہد بن جبر ہیں جو مشہور راوی تفسیر ہیں اور حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر بہت

[1] یہ ایک مسجد میں کچھ قصے بیان کر رہے تھے اور ایک جماعت سن رہی تھی کہ مسجد کی چھت بیٹھ گئی۔ اور یہ اپنی جماعت کے ساتھ دب کر جان بحق تسلیم ہو گئے۔ یہ واقعہ بقول صحیح ۱۳۰ھ کا ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

[2] ربذہ۔ مدینہ طیبہ سے قریب مکہ معظمہ کے راستے پر ایک بستی تھی۔ وہیں کے رہنے والے تھے۔ اس لئے انھیں ربذی کہتے ہیں۔ ان کے بھائی عبداللہ بن عبیدہ بھی انہی جیسے منکر الحدیث تھے۔ جن سے ان کے بھائی موسیٰ کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا تھا۔

روایت کیا کرتے ہیں سلاسلہ میں بزمانہ خلافت حضرت فاروق اعظمؓ پیدا ہوئے تھے اور سنہ ۱۴۸ھ میں وفات پائی. سلیمان بن مہران الاعمش جو کوفے میں شہور شیعہ محدث تھے۔ جن کے متعلق متعدد ائمہ حدیث کا قول ہے کہ اہل کوفہ کی حدیثوں کو اعمش الکوفی اور ابو اسحٰق السبیعی الکوفی نے برباد کیا۔ اور یہ دونوں شیعہ تھے۔ مگر اہل سنت نے بھی ان دونوں سے بہت حدیثیں لی ہیں۔ انھیں اعمش صاحب کا قول ہے کہ مجاہد بن جبر کہتے تھے کہ "اگر عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق ہم قرآن پڑھتے ہوتے۔ تو ہمیں عبداللہ بن عباس سے قرآن کی اکثر آیتوں کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی"؛ غالباً یہ قول اعمش کوفی کا بہتان ہے مجاہد نے کبھی نہیں کہا ہوگا۔ ورنہ بقول اہل کوفہ عبداللہ بن مسعودؓ نے تو اپنے مصحف کو محفوظ رکھا تھا۔ اور جب حضرت عثمانؓ نے بقول محدثین و مؤرخین قرآن کا ایک نسخہ کوفہ بھیج کر اہل کوفہ کو حکم دیا کہ ہر شخص اپنے مصحف کو اسی نسخے کے مطابق صحیح کرے اور جو مصحف اس نسخہ سے اختلاف رکھتا ہو۔ اس کو ضائع کر دے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود نے انکار کر دیا کہ اور اہل کوفہ سے کہا کہ تم لوگ اپنے مصاحف کو ضائع نہ کرو۔ اپنی حالت پر رہنے دو۔ چنانچہ اہل کوفہ میں سے حضرت ابن مسعود کے شاگردوں کے پاس انہیں کی قرأت کے مطابق مصاحف رہ گئے تھے اور ہر جگہ مصحف عثمانی کا رواج ہو گیا تھا۔ اگر مجاہد بن جبر کو مصحف ابن مسعود کی تلاش تھی۔ تو وہ کوفہ چلے آتے۔ اور ابن مسعود کے کسی شاگرد سے لے لیتے۔ اس میں دشواری کیا تھی۔ اور پھر اعمش تو کوفی ہی تھے۔ ان کے پاس تو ضرور وہی مصحف ہوگا۔ جو حضرت ابن مسعود کی قرأت کے مطابق ہوگا۔ اور یہ مجاہد ہی کے شاگرد تھے۔ جس وقت استاد سے یہ بات سنی تھی۔ اپنے پاس سے نکال کر حضرت ابن مسعود کا قرآن مجاہد کے سامنے پیش کر دیتے کہ لیجئے حاضر ہے۔ اب تو واویلا نہ مچائیے۔

مجاہد بن جبر و سائب بن ابی السائب کے غلام تھے۔ مگر سائب بن ابی سائب کو کوئی تو صحابی لکھتا ہے۔ اور کوئی لکھتا ہے کہ یہ کافر تھے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ممکن ہے کہ مجاہد عبداللہ بن السائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ ہوں۔ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں ابتداء میں رہے۔ مگر بعد کو کوفے میں بہت دنوں تک رہے۔ اور ان سے بہت سے کوفیوں نے تفسیری روایتیں منسوب کیں۔ ان کو ائمہ رجال بہت سخت مدلس لکھتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ تدلیسیں خود انھیں نے کیں۔ یا ان کے شاگردوں نے کیں۔ اور وہ ان کے سر منڈھ گئیں۔ ان کی کتاب تفسیر بھی جو پوری کی پوری حضرت ابن عباس سے مروی تو نہ تھی۔ بلکہ اسرائیلی قیدیوں کی اولاد سے پوچھ پوچھ کے بہت سی باتیں اسرائیلیات کی بھی ان میں بھری تھیں۔ اس پوری کتاب کے راوی ان سے صرف قاسم بن ابی بزہ ہمدانی ہی تنہا بلا شرکت غیرے تھے۔ اور ہم نے نزدل عیسےٰ کی حدیثوں کی تنقید میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ہمدانیوں میں عام طور سے تشیع تھا۔ اسی لئے قاسم بن ابی بزہ کے شاگردوں میں سے نطر بن خلیفہ الکوفی جو ابو بکر الخناط کے غلام آزاد کردہ تھے۔ وہی سب سے زیادہ مجاہد بن جبر کی تفسیر کی حدیثیں ان سے روایت کیا کرتے تھے۔ اور نطر بن خلیفہ مشہور و معروف شیعہ تھے۔ مگر بہر حال جو بھی مجاہد کی تفسیری حدیثیں روایت کرتا ہے۔ وہ قاسم بن ابی بزہ ہی کی کتاب سے روایت کرتا ہے۔ کیونکہ مجاہد سے تفسیری حدیثوں کی روایت قاسم بن ابی بزہ کے سوا اور کوئی نہیں کرتا۔ تہذیب التہذیب ج۸ ص۳۱۰۔

مقاتل بن سلیمان الخراسانی یہ بہت بڑے مفسر ہیں۔ اس حد تک کہ بعض لوگوں نے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ الناس عیال علےٰ مقاتل فی التفسیر (یعنی لوگ تفسیر میں مقاتل کے محتاج ہیں۔ جس طرح صاحب خانہ کے محتاج نان و نفقہ میں اس کے اہل و عیال ہوتے ہیں")۔ اس سے بڑھکر کسی مفسر کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ یہ ضحاک بن مزاحم اور مجاہد بن جبر دونوں کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی تفسیر کو دیکھ کر نعیم بن حماد اور عبداللہ بن مبارک کہتے تھے کہ کاش یہ ان تفسیروں کی کوئی سند بھی رکھتے۔ (یعنی محض اپنی رائے سے بلا سند و بلا دلیل تفسیریں لکھتے تھے۔ ابن مبارک نے ایک بار یہ بھی کہا کہ اگر یہ ثقہ ہوتے تو ان کی تفسیر بہت اچھی ہوتی۔ جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ نہ تھے۔ ان کا خود یہ بیان تھا کہ ضحاک بن مزاحم کے یہاں تفسیر سننے کے لئے جاتے تھے۔ تو حجرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ اور دونوں کے درمیان تخلیہ میں تفسیری باتیں ہوتی تھیں"۔ ایک بار سفیان ابن عیینہ کے سامنے مقاتل کا یہ بیان نقل کیا گیا کہ "میں مزاحم کے یہاں جاتا تھا۔ تو وہ دروازہ بند کر دیا جاتا تھا" تو ابن عیینہ نے کہا کہ ضرور بند کر دیا جاتا تھا مگر مدینے کا دروازہ"۔ یعنی فیضان نبوی کی آمد موقوف ہو جاتی تھی۔

مگر جو یبر بن سعید ان کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ جو یبر نے مقاتل کا یہ دعوی سنا تو کہا کہ جس وقت ضحاک کی وفات ہوئی ہے۔ اس وقت مقاتل کم سن بچے ہوں گے۔ اور ابراہیم حربی کا بیان ہے کہ ضحاک کی وفات تو مقاتل کی پیدائش سے چار سال پہلے ہوئی تھی۔ ابراہیم حربی نے کہا کہ کلبی کی تفسیر اور مقاتل کی تفسیر دونوں برابر ہیں۔ اور کلبی تو ایک مشہور کذاب تھے۔ ان کی تفسیر کے برابر ان کی تفسیر ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں سمجھے۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ مقاتل بن سلیمان کے متعلق ائمہ رجال و حدیث کی کیا رائیں ہیں وکیع بن جراح اور دار قطنی نے ان کو جھوٹا کہا۔ اور متروک الحدیث شمار کیا۔ یعقوب بن سفیان نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے۔ جن سے روایت کرنا جائز نہیں۔ عجلی نے بھی ان کو متروک الحدیث لکھا ہے۔ یہ سب تو ابن حجر نے انھیں کے ترجمے میں تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۲۷۹ سے ص۲۸۵ تک اور حالات کے ساتھ لکھا ہے اور جلال الدین سیوطی نے اتقان ص۵۵۵ میں لکھا ہے کہ فی المقاتل من المذاھب الردیۃ "یعنی مقاتل میں مذہبی حیثیت سے خرابیاں تھیں"۔ اور ابن حجر تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۶۶ ترجمہ محمد بن عمر الواقدی میں امام نسائیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹی باتیں لگاتے ہیں۔ ان میں سے چار شخص بہت مشہور ہیں۔ مدینے میں واقدی۔ خراسان میں مقاتل بن سلیمان۔ شام میں محمد بن سعید المصلوب اور چوتھے کا ذکر نہ کیا۔ یا امام نسائی سے روایت کرنا والے بھول گئے۔ مگر دوسری جگہ نسائی کا یہ قول یوں نقل کیا ہے کہ ابراہیم بن ابی یحیےٰ مدینہ میں۔ واقدی بغداد میں۔ مقاتل خراسان میں، اور محمد بن سعید المصلوب شام میں۔ مقاتل کی وفات سنہ ۱۵۰ھ میں لکھی ہے۔

اور پھر مقاتل صاحب بڑے سیاسی داؤ پیچ کے تھے۔ آخر خراسانی ہی تھے۔ دعوت عباسیہ کے فتنے میں یہ بڑے سرگرم کارکن تھے۔ اور عمال حکومت کے خلاف سازشوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ابن خلدون ج۲ ص۱۱۵ سے ص۱۱۶ تک دیکھ جائیے۔

[اس کتاب میں محاذ تفسیر کو سمجھنے کے لئے اتنا بہت کافی ہے۔ پوری حالت معلوم کرنے کے لئے میری کتاب تراجم المفسرین کی اشاعت کا انتظار فرمائیے]

حقائق و عبر

مولوی یہ ہوتا ہے

جماعت اسلامی کے جریدہ "تسنیم" (بابت ۵ اپریل) کے صفحۂ اول پر یہ خبر شائع ہوئی ہے۔

"جماعت اسلامی کی تحریک وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اٹھی ہے اور عوام میں تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہی ہے۔ اس کی ترقی اور مقبولیت ہمارے لئے باعث فخر ہے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو جناب مولانا ظفر احمد عثمانی نے جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کی تربیت گاہ میں شرکا کی ایک بہت بڑی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے کہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ "جناب مولانا ظفر احمد عثمانی" کون بزرگ ہیں؟ یہ وہی مولانا ہیں جو اس سے پہلے اسی جماعت اسلامی کے امیر سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے متعلق حسب ذیل فتویٰ صادر فرما چکے ہیں۔

بظاہر یہ شخص منکر حدیث ہے۔ دائرۂ اسلام سے خارج تو نہیں مگر گمراہ اور مبتدع ہے۔
ایسے شخص سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہیئے۔
اور اس کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا چاہیئے
اس کو جاہل اجہل سمجھنا چاہیئے

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ
(از ڈھاکہ۔ ۲ ر رجب ۱۳۷۲ھ)

یہ تھا دو برس قبل 'حضرت مولانا' کا فتویٰ 'جناب مودودی صاحب' کے متعلق۔ اور اب یہی حضرت مولانا صاحب اس منکر حدیث، گمراہ، مبتدع، ناقابل اعتماد، جاہل اجہل، شخص کی تحریک کے متعلق فرما رہے ہیں کہ یہ تحریک وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اور اس کی ترقی اور مقبولیت مولانا صاحب کے لئے باعث فخر ہے۔ علاوہ اور باتوں کے ذرا ان حضرات کی دیانت ملاحظہ فرمایئے کہ نہ تو یہ مولانا صاحب اپنے اس فتویٰ کا کوئی ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی اسلامی جماعت ان سے اس کے متعلق ایک لفظ تک کہتی ہے حالانکہ انہیں اس فتوے کا پورا پورا علم ہے۔ یہ سب اس لئے کہ یہ مولانا حضرات اسلامی جماعت کے پروپیگنڈے سے خائف ہیں اور ان کا ساتھ دینے میں بہت سے مفاد کی توقع رکھتے ہیں۔ اور اسلامی جماعت کو ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ مولویوں کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔

سوچیئے کہ جو لوگ آج یہ کچھ کر سکتے ہیں وہ سلاطین کے درباروں میں کیا کچھ نہیں کرتے ہوں گے؟ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب ہے، اس قوم پر جوان لوگوں کی ان تمام کرتوتوں سے واقف ہونے کے باوجود، انہیں بدستور اپنا راہ نما اور پیشوا مانتی چلی جاتی ہے۔

تعدد ازدواج

انجمن خواتین پاکستان (اپوا) کی طرف سے، وزیر اعظم کی دوسری شادی کے سلسلہ میں جو مہم جاری ہے، وہ اندرون ملک اور بیرون پاکستان دونوں میں دلچسپی کا موضوع بن رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ ٹکڑا یہ ہے کہ انجمن کی سکریٹری (بیگم حسین ملک) نے، اپنی پریذیڈنٹ، بیگم لیاقت علی خاں (یعنی رعنا لیاقت علی خاں) کو لکھا کہ وہ اس تحریک کے متعلق انجمن کو اپنے خیالات اور راہ نمائی سے سرفراز فرمائیں۔ یہ لکھتے وقت، سکریٹری صاحبہ قطعاً بھول گئیں (اور اگر ایسا دانستہ کیا گیا تھا تو یہ نہایت "تلخ و شیریں مذاق تھا) کہ صدر صاحبہ، خود اپنے خاوند (مرحوم لیاقت علی خاں) کی دوسری بیوی تھیں اور انہوں نے خان صاحب مرحوم کی بیگم اول سے تمام اعزازات اسی طرح چھین رکھے تھے جس طرح وزیر اعظم محمد علی کی دوسری بیوی نے، بیگم اول کے مناصب غصب کر لئے ہیں اور جن کی بازیابی کے لئے انجمن خواتین نے یہ تحریک اٹھا رکھی ہے۔ سکریٹری صاحبہ نے اس استفسار سے صدر صاحبہ کو گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل والے مخمصہ میں ڈال دیا۔ اگر وہ اس تحریک کی تائید کرتی ہیں تو بیگم عالیہ سے یہ طعن سننے کا ڈر ہے کہ "بہن! میں نے تو یہ کچھ تمہیں سے سیکھا ہے۔ اس لئے چھاج تو بولے چھلنی کیا بولے؟" اور اگر صدر صاحبہ اس تحریک کی مخالفت کرتی ہیں تو "اپوا" کی صدارت چھن جانے کا خطرہ ہے۔

غرض دو گونہ عذاب است.......

لیکن بیگم رعنا بھی کچی گولیاں کھیلی ہوئی نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک پولٹیکل جواب دیا ہے کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لکڑی بھی نہ ٹوٹے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں اس کا متعین جواب تو مزید تفاصیل معلوم کر کے دوں گی جب میں کراچی آؤں گی۔ لیکن اس دوران میں میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ خواتین ذرا متانت اور سنجیدگی سے کام لیں اور ذاتیات میں نہ الجھیں۔

ہمارا خیال ہے کہ صدر صاحبہ کو چاہیئے کہ اس طرح کی سکریٹری سے جواب طلب کریں جس نے اس قسم کا استفسار کرتے وقت نزاکت حالات کا قطعاً احساس نہیں کیا۔ اور صدر کو ایسی مشکل (AWKWARD) پوزیشن میں ڈال دیا کہ

نہ بھاگا جائے ہے اس سے نہ ٹھیرا جائے ہے اس سے

نہ صرف صدر صاحبہ کو بلکہ پوری کی پوری اپوا کو مشکل میں ڈال دیا۔ اگر بیگم عالیہ نے اپوا سے کہہ دیا کہ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو اور وزیر اعظم محمد علی نے کہہ دیا کہ جو مطالبہ مجھ سے کیا جا رہا ہے (کہ خاتون مملکت بیگم اول ہی کو رہنا چاہیئے) وہ مطالبہ لیاقت علی خاں مرحوم سے کیوں نہیں کیا گیا تھا تو اس کے لئے کس قدر خفت کا سامنا ہو گا ——!

آہ بیچاری اپوا۔

سوئی گیس

(صفحہ ۶ سے آگے)

ان حالات میں ہم حکومت اور پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی سے التماس کرتے ہیں کہ وہ گیس کے استعمال میں فضول خرچی کا ثبوت نہ دے اور اس کی مدات استعمال میں صرف انہی کو ترجیح دے جس سے ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ اگر اس کے بعد بھی گیس بچ جائے اور یہ اطمینان ہو کہ ضروری مدات کو نقصان نہیں پہنچے گا تو پھر اسے کاروں وغیرہ جیسی مدات پر استعمال کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن کی رو سے قدرت کی طرف سے عطا کردہ ذرائع تمام نوع انسانی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ملتے ہیں اس لئے ان میں نفع اندوزی کا جذبہ کہیں نہیں آنا چاہیئے۔ ضرورتمندوں تک اس طرح پہنچانا چاہیئے کہ اس میں نفع حاصل کرنے کا عنصر بالکل نہ آنے پائے۔

آپ
طلوع اسلام
کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

اپنے احباب کو طلوع اسلام کا خریدار بنایئے۔
اپنے شہر میں طلوع اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔
کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوع اسلام کا لٹریچر منگائے۔
اپنے علاقہ سے طلوع اسلام کیلئے
اشتہار مہیا کیجئے

باب المراسلات

عید الفطر متعدد مقامات سے استفسارات موصول ہوئے ہیں کہ عید الفطر کس تقریب کی یاد میں منائی جاتی ہے اور اس تیوہار کی غایت کیا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ رمضان المبارک اور اس کے خاتمہ پر عید الفطر درحقیقت نزول قرآن کی سالگرہ منانے کا مقدس جشن ہے۔ دنیا میں عام طور پر جشن و مسرت کے تیوہار، موسموں کی تبدیلی۔ یا کسی انسان کی یادگار قائم کرنے۔ یا کسی تاریخی واقعہ کو محفوظ رکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ موسموں کا تغیر خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں۔ اور دنیاوی واقعات بھلائے جاسکتے ہیں لیکن خدا کا وہ پیغام جو قرآن کریم کے اندر محفوظ کرکے رکھدیا گیا ہے۔ کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے لی ہے۔ جو زندہ ہے اور کبھی مر نہیں سکتا۔ ایسا قائم ہے کہ اسے فنا و زوال نہیں۔ یہ جشن عید اس خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب کے نزول کی یادگار ہے۔ اس جشن کو منانے کے لئے مہینہ بھر سے تیاریاں کی گئیں (وہ تیاریاں بھی درحقیقت اسی جشن کا ایک جزو تھیں) اسلام قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ زبردستی کی اطاعت نہیں۔ بلکہ دل کی پوری رغبت سے اطاعت۔ یہ انہی قوانین کی اطاعت ہے کہ ایک عبد مومن حرام اور ناجائز شے کو چھو نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھوں کسی شخص کے مال، جان، عزت و آبرو کو ناحق کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اسی جذبۂ اطاعت کی تقویت کے لئے حکم دیا گیا کہ اس کے حکم کے ماتحت کچھ وقت کے لئے حلال اور طیب چیزوں کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ حرام اور ناجائز کی طرف کبھی نگاہ بھی نہ اٹھنے پائے۔ انھیں دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کا خوگر بنایا گیا۔ تاکہ یہ جہاد زندگی کے سخت ترین مرحلوں سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کے عادی ہو جائیں۔ گویا یہ ایک سالانہ ٹریننگ کیمپ تھا جس میں زندگی میں تازہ ولولے پیدا کرنے کے سامان فراہم کئے گئے تھے۔ ایک یادداشت تازہ کرنے والا (REFRESHER COURSE) تھا جس میں خدا اور بندے کے براہ راست تعلقات کی یاد تازہ کی گئی تھی سالانہ محاسبہ (STOCK TAKING) تھا۔ جس میں سال بھر کے اعمال اور نتائج کی جانچ پڑتال کرکے جائزہ لینا تھا کہ ہم ایک سال میں کس حد تک آگے بڑھے ہیں۔ جب پورے ایک ماہ کی محنت اور اطاعت کے بعد دلوں میں تزکیہ، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہوگئی تو ان تمام کو یکجا جمع ہونے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ انھیں اس زندگی کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے۔ جو جماعت مومنین کی خصوصیت ہے۔ اور جس کے درسے قرآن کریم کے ایک ایک ؎

؎ صفحہ پر بچے موتیوں کی طرح ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سوچ بچار کے بعد اپنے لئے ایک پروگرام تیار کرلیں۔ جس کا اعلان ان کا منتخب امام اپنے خطبہ میں کرے۔ اس کے بعد ان کے نمائندے اس طے شدہ پروگرام کو لے کر ملت اسلامیہ کے مرکز محسوس یعنی بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو جائیں۔ جہاں ان مختلف مقامی پروگراموں کی روشنی میں تمام ملت کے لئے مشترکہ نظام تجویز کیا جائے۔ یہ ہیں اس جشن مسرت کے مختلف اجزا اور یہ ہے ان اجزاء کی اجمالی تفصیل انھیں سامنے رکھئے۔ اور پھر دیکھئے کہ یہی تقریبیں جن کے ہر گوشہ بساط پر کبھی زندہ آرزوئیں مچلتیں اور تازہ ولولے رقص کرتے تھے۔ ان کی روح کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر کس طرح رفتہ رفتہ رسمی اجتماعوں کی شکل اختیار کرگئیں۔ بقول علامہ اقبال علیہ الرحمتہ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے ۔۔۔ وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج ۔۔۔ یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

بزمِ طلوعِ اسلام

اس وقت آپ طلوع اسلام پڑھ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ آپ برسوں سے طلوع اسلام پڑھتے چلے آرہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ اسے اس لئے پڑھتے ہیں کہ آپ کو اس کے پیش کردہ فکر سے اتفاق ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ جس قرآنی نظام کا نقشہ ان صفحات میں پیش ہوتا رہتا ہے وہ جلد سے جلد قائم ہو تاکہ ظلم کا استیصال ہو۔ عدل عمرانی کا چرچا ہو اور افراد معاشرہ نشوونما ارتقاء کے تمام ممکن ذرائع سے متمتع ہوسکیں۔ یہ قدرتی خواہش آپ کے دل میں کئی مرتبہ پیدا ہوئی ہوگی اور آپ نے بڑی بے صبری اور بے چینی سے چاہا ہوگا کہ اس کے حصول کی کوئی صورت نکل آئے اب جب آپ طلوع اسلام پڑھ کر اس فضا میں پہونچے ہیں تو آپکے دل میں پھر سے ویسے ہی خیالات موجزن ہوں گے۔ آج ذرا طبیعت کے اس رنگ کا فائدہ اٹھائیے اور طلوع اسلام کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد یہ نہ کیجئے کہ اے کاش ایسا معاشرہ جلد قائم ہو جائے بلکہ ایک عملی آدمی کی حیثیت سے یہ سوچئے کہ ایسا معاشرہ قائم کیسے ہو سکتا ہے۔ اور آپ اس کے قائم کرنے میں کیا مدد دے سکتے ہیں؟

ایک قائم معاشرے کی جگہ نیا معاشرہ اس وقت تک نہیں لے سکتا جب تک کہ افراد معاشرہ حاضرہ موجودہ سے بے زار نہ ہو جائیں اور ان کے دل و دماغ میں بہتر معاشرے کا تصور موجود نہ ہو اس کے بعد ضروری ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد جمع ہو جائیں۔ جو رائج معاشرے سے بیزار ہیں اور اس کی بجائے نیا نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ جوں جوں یہ دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور لوگ اس میں داخل ہوتے جاتے ہیں اسی طرح رفتہ رفتہ افراد معاشرہ اس حد تک نئے تصورات سے سرشار ہو جاتے ہیں کہ وہ بوسیدہ نظام کو اکھاڑ پھینکتے ہیں اور اس کے کھنڈرات پر نئی منزل کھڑی کر دیتے ہیں۔ اب آپ دیکھیے کہ کیا آپ نے ہم خیال پیدا کرنے اور انھیں ایک رشتہ میں پرونے کا کچھ بندوبست کیا ہے۔ مثلاً آپ نے اپنا مافی الضمیر کسی کے سامنے پیش کیا۔ جو پہلے اسے نہیں جانتا تھا؟ یا آپ اپنی خلوتوں سے نکل کر اس راہ پر کبھی گئے ہیں۔ جہاں اور ہم خیال بھی مل سکتے ہیں؟ اگر آپ نے ایسا کرلیا ہے تو آپ نے بیج بو دیا ہے۔ اب اس کی آبیاری کیجئے اور دیکھئے کہ اس بیج کی کونپل پھوٹے اور بالآخر وہ شجر طیب بن کر رہے جس کی جڑیں پاتال تک پہونچ جاتی ہیں۔ اور شاخیں آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں۔ اس درخت کا استیصال امر محال ہو جاتا ہے۔

اگر آپ نے ابھی ایسا نہیں کیا تو آئیے اٹھ کر ذرا آس پاس دیکھیے کتنے لوگ ایسے ہیں جو آپ ہی کی طرح طلوع اسلام پڑھتے چلے آتے ہیں اور سینوں میں آپ ہی کی طرح کی خواہشات دبائے پھرتے ہیں۔ یہ آپ کے معاونین اور رفقائے کار ہیں ان سے رابطہ پیدا کیجئے۔ کبھی مل بیٹھئے اور تبادلہ خیالات کیجئے رفتہ رفتہ آپ محسوس کریں گے کہ اس سے پیشتر کبھی کبھی آپ پر تنہائی اور یاس کے جو احساسات غالب آجایا کرتے تھے۔ وہ اب کافور ہوتے جارہے ہیں۔ اور آپ میں مقصد کے حصول کے لئے ایک ولولۂ عمل بیدار ہوتا جارہا ہے۔ آپ کے رفقاء بھی ایسے ہی محسوس کررہے ہیں۔ اس فضا میں آپ دیکھیے گا کہ کام ہونا شروع ہو جائے گا۔ آپ اس راہ پر ایک مرتبہ چل دیجئے۔ پھر آپ کا ہر قدم آپ کو منزل سے قریب تر کرتا جائے گا۔ اگر آپ کو ہم خیال تلاش کرنے میں دقت ہو تو ہمیں اطلاع دیجئے ہم آپ کا نام طلوع اسلام میں شائع کردیں گے۔ اس پر مقامی قارئین آپ سے رابطہ پیدا کرلیں گے۔ ہم نے خریداروں کی قصبہ وار فہرست بھی تیار کرلی ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں سے ہم آپ کے شہر کے خریداروں کا نام دے سکتے ہیں۔

آپ اور آپ کے رفقائے کار مل بیٹھیں تو اس اجتماع کو "بزم طلوع اسلام" کا نام دیجئے۔ اس کی تحویل میں ایک لائبریری قائم کیجئے جو طلوع اسلام اور اس کی مطبوعات کو ان تک پہنچانے کا ذریعہ ہو جو اب تک ان سے بے خبر ہے۔ یا جو انھیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس طرح آپ کا مرکز بن جائیگا تو پھر آپ کے پاس ایک طرف ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کی تحریک سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں گے ان کی پوری تشفی کیجئے۔ طلوع اسلام کے فکر سے قدرے اجنبی ہونے کی حیثیت سے ضرورت ہوگی کہ انھیں مناسب طریق سے اس فکر سے متعارف کرادیا جائے۔ آپ یہ فریضہ انجام دیجئے اس طرح آپ کو اور رفقائے کار مل جائیں گے۔ دوسری طرف آپ کے پاس بعض ایسے حضرات بھی آئیں گے جو خواہ مخواہ کی حجت پیدا کریں گے اور کام میں رخنے ڈالیں گے۔ ان کے اعتراضات کا تو پورا پورا جواب دیجئے۔ لیکن ان سے زیادہ مت الجھئے۔ کیونکہ انھیں کام سے سروکار نہیں۔ ان میں نہ کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ نہ وہ کسی کو کام کرنے ہی دیتے ہیں

واہ چھاؤنی یہ دیکھئے۔ واہ چھاؤنی نے ہمت کی تو بزم طلوع اسلام قائم ہوگئی۔ اس کا پہلا اجلاس منعقد ہو چکا ہے۔ اس میں رائے محمد اختر خاں صاحب کو بزم کا ترجمان منتخب کیا گیا۔ بزم نے فیصلہ کیا ہے کہ کوارٹر نمبر ۲۱/۱۱ [illegible]

تاریخی شواہد (صفحہ سے آگے)

بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۔ یعنی ان چیزوں کی عظمت و تقدس کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند تمہارے پاس نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو منزّل من اللہ ہو۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھ کر دیکھ لیجئے۔ یہ "دھرم کانٹا" جو وزن بتلائے وہی درست اور صحیح ہے۔ خواہ آپ کا ذہن یا اسلاف پرستی کے معتقدات کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ محض اسمار کو دلیل اور حجت سمجھ لینا، حقیقت فراموشی اور خود فریبی ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے فقط ایک ہے اور وہ ہے مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ جو اللہ نے نازل کیا ہے۔

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ

قیمت چار روپے

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں۔

۱۹۴۹ء اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر۔
۱۹۵۰ء نومبر (ایک پرچہ)
۱۹۵۱ء مارچ تا نومبر۔
۱۹۵۲ء اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء پورے سال کے

یہ پرچے خریدارانِ طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام، کراچی

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز — سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ؛ اسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گردپوش۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم — از پرویز — سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق، قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ، وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۰ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے دو سو چوبیس صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ چار سو اٹھ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے منظومات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو۔ اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ ساتھ ہی دورِ آزادی کی مسخ ہوتی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہیں۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۰ صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً ۴۰۰ صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینے میں۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت بھی دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور، دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت سوا تین سو صفحے۔

قیمت — قسم اول: چھ روپے — قسم دوم: چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶۔ قیمت دو روپے

نوٹ:۔ تمام کتابیں مجلد ہیں اور گردپوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

عالمِ اسلامی

ٹیونس اور فرانس کے مابین داخلی آزادی کے سلسلہ میں جو مذاکرات گذشتہ سال سے شروع ہیں۔ ان سے متعلق خبر ہے کہ اس ماہ کے آخر میں کچھ تصفیہ ہو جائے گا۔ تصفیہ دراصل ہو چکا ہے لیکن اس کی تفاصیل شائع نہیں ہوئیں۔ ٹیونس کے قائد حبیب بورقیبہ نے اسے سراہا ہے۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ تصفیہ قابلِ قبول ہے لیکن ٹیونس میں ایسا طبقہ موجود ہے جو داخلی آزادی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور وہ مکمل آزادی پر مصر ہے۔ مکمل آزادی کا مطالبہ یوں تو بالکل حق بجانب ہے لیکن اس پر اصرار کی خصوصیت سے یہ وجہ ہے کہ فرانس نے داخلی آزادی دینے میں بھی بڑے بخل سے کام لیا ہے۔ اور اس سے متعلق مذاکرات ایک عرصہ بڑی وجہ معطل رہے کہ وہ پولیس کو ٹیونس کی تحویل میں دینے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔ اس سے متشدد طبقہ کا پیدا ہو جانا بالکل قدرتی امر ہے نیز یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ فرانس نے ٹیونس کے ہمسایہ ممالک الجیریا اور مراکش سے ابھی تک کسی قسم کے مذاکرات شروع نہیں کئے۔ اس سے بجا طور پر ان علاقوں میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب سارے مغرب اقصیٰ میں پھر سے بدامنی کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ ان دنوں ٹیونس، الجیریا اور مراکش سب ہی جگہوں پر مظاہرے ہوئے۔ جن میں مظاہرین نے آزادی کا مطالبہ کیا۔ اس کا جواب فرانس نے مزید فوجیں بھیج کر دیا۔ چنانچہ جگہ بہ جگہ آزادی خواہوں اور فرانسیسی فوجوں میں جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ فرانس فوجی طاقت پر بھروسہ کر رہا ہے اور مزید کمک بھیج رہا ہے۔ ہند چینی میں آٹھ سال ٹھوکیں مارنے اور ذلت آمیز شکست کھا جانے کے بعد بھی فرانس کو ہوش نہیں آیا۔ اور وہ بدستور فوجوں کے زور پر آزادی کی تحریک کو کچلنے میں مصروف ہے۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ ہند چینی سے فارغ ہو کر وہ زیادہ یکسوئی سے مغرب اقصیٰ میں فوجی طاقت کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ وقتی طور پر درست ہو سکتا ہے لیکن زود یا بدیر فرانس کا شمالی افریقہ میں بھی وہی حشر ہوگا جو ہند چینی میں ہو چکا ہے۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانانِ عالم مظلومین مغرب اقصیٰ کی کچھ مدد نہیں کر سکے۔ وہ اپنے اپنے دھندوں میں الجھ کر زبانی جمع خرچ کافی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ واقعی عملی امداد کا پروگرام بنائیں۔ تو فرانسیسی تشدد و بربریت کا کم سے کم وقت میں خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

ان ممالک کا عرب ہمسایہ جو بزعم خویش عربی وحدت کا علم بلند کئے ہوئے ہے عراق کو "آزاد" کرانے میں مصروف ہے عراق ایک عرصے سے شکایت کر رہا ہے کہ مصر میں ایک خفیہ "آزاد عراق ریڈیو" کام کر رہا ہے جو عراق کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف ہے۔ عراق اس کے خلاف مصر سے کئی بار گفتگو کر چکا ہے۔ لیکن اس کا کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ اب عراقی وزیر اعظم نوری السعید نے مصر میں متعینہ عراقی سفیر نجیب الراوی کو بغداد طلب کیا ہے۔ الراوی اپنے وطن جانے سے پہلے کرنل ناصر سے بھی اس سلسلہ میں مل چکے ہیں۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مصر، سعودی عربیہ اور شام سے مل کر جو نیا دفاعی معاہدہ مرتب کر رہا ہے وہ سراسر عراق کے خلاف ہے۔ انھوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ اگر مصر کا مقصد اسرائیلی خطرے کا مقابلہ ہوتا تو اس کے لئے پہلے سے دفاعی معاہدہ موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر موجودہ معاہدہ کو ناکافی سمجھا جاتا ہے تو اس میں مناسب اصلاح و ترمیم کر لی چاہیئے۔ اور عراق اس کے لئے پوری طرح تیار ہے۔ عراق کا یہ موقف بڑا معقول ہے اور اگر مصر کو واقعی عرب یا مسلمانوں کا دفاع و تحفظ مقصود ہو تو اسے دوسرے ممالک سے اتحاد و تعاون کا ثبوت دینا ہوگا۔ نہ کہ ان کی بلا وجہ مخالفت کر کے انھیں اپنے سے اور دور کرنا ہوگا۔ تعجب ہے کہ مصر اب تک اس رویہ پر قائم ہے۔ حالانکہ بندونگ کی ایشیائی افریقی کانفرنس میں یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ہر ملک کو دفاعی تنظیموں میں شریک ہونے کا حق ہے اس کے باوجود مصر عراق کا یہ حق تسلیم نہیں کرنا چاہتا کہ وہ ترکی اور پاکستان سے معاہدہ کر سکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں پاکستان نے ممالک اسلامیہ میں معاشی تعاون کی ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی (P.I.D.C) نے جو پاکستان میں صنعتی ترقی کی بہت حد تک ذمہ دار ہے ترکی میں ترکی اور پاکستان کے مشترکہ سرمایے ڈیڑھ کروڑ روپے سے ایک جوٹ مل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کارخانہ دو سال بعد تیار ہو کر کام کرنا شروع کر دے گا۔ اور ابتداً اتنا مال تیار کرے گا جو ترکی کی ضروریات کے لئے کافی ہوگا اسی طرح کے کارخانے مصر اور عراق میں بھی قائم کئے جائیں گے چنانچہ دونوں ممالک سے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ ایسے اقدامات متعلقہ ممالک کو قریب تر لانے میں بھی ممد ہو سکتے ہیں اور ان کی معاشی ترقی کے بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس پر پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی ہزار تبریک کی مستحق ہے۔

بین الاقوامی جائزہ

بین الاقوامی سیاست میں بظاہر تعطل سا ہے۔ اور گذشتہ ہفتہ میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ ہو نہیں رہا۔ عالمی سیاست کی ساری توجہ اس وقت روس کی "مساعی امن" پر مرکوز ہے۔ اس نے اقوام مغرب کے دفاعی اقدامات میں رخنے پیدا کرنے کی اب یہ تدبیر نکالی ہے کہ بہلا پھسلا کر زیادہ سے زیادہ ممالک کو غیر جانبدار بنا لے اس کے لئے اس نے اقوام مغرب کی اعلیٰ کانفرنس کی تجویز کو منظور کر لیا ہے اور اس طرح انھیں یہ "یقین" دلا دیا ہے کہ وہ عالمی کشیدگی کم کرنے کے ذرائع سوچنے کے لئے تیار ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یورپ میں اس نے آسٹریا کو غیر جانبدار بنا لیا ہے۔ اب اس نے یوگوسلاویہ کو غیر جانبدار بنانے کی بازی لگائی ہے مارشل بلگانن اور کروشیف کا بذات خود بلگریڈ جانے کا فیصلہ ظاہر کرتا ہے کہ روس اس مقصد کے حصول کے لئے آخری بازی لگانے کے لئے تیار ہے۔ یوگوسلاویہ روس کا حلقہ بگوش تھا لیکن وہ "باغی" ہو کر مغرب کی طرف جھک گیا۔ اور ترکی کی مساعی سے معاہدہ بلقان میں شریک ہو کر بالواسطہ ناٹو سے منسلک ہو گیا۔ کیونکہ اس کے دوسرے معاہد ممالک ترکی اور یونان ناٹو کے رکن ہیں۔ ایسے نظر آتا ہے کہ روسی قائدین کے دورہ یوگوسلاویہ کا راستہ ہندوستان نے صاف کیا۔ ابھی پچھلے دنوں مارشل ٹیٹو ہندوستان آئے۔ مارشل موصوف کا پنڈت نہرو سے ملنا بظاہر دور از کار سی بات معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ دونوں کے مفادات میں کوئی ایسا اشتراک نہیں تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو نے مارشل ٹیٹو کو غیر جانبداری کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اور اس طرح دانستہ یا نادانستہ روس سے گفتگو کرنے کے لئے فضا تیار کی۔

یوگوسلاویہ کے ساتھ روس کی کوشش جرمنی کو غیر جانبدار بنانے کی ہے تاکہ اس کی فوجیں اقوام مغرب کے کام نہ آسکیں اس کے لئے وہ وحدت کا سبز باغ دکھا رہا ہے۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ وارسا میں جو آٹھ قومی اشتراکی کانفرنس ہوئی۔ اور جس میں اشتراکی ناٹو کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس میں مشرقی جرمنی کو شریک نہیں کیا گیا۔ ایسا "مصلحتاً" کیا گیا ہے۔ تاکہ مغربی جرمنی کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ روس متحدہ جرمنی کے لئے کوشاں ہے۔ جرمنی کا مسئلہ خصوصیت سے دول اربعہ کی اعلیٰ کانفرنس میں سامنے آئے گا۔

مشرق میں چین بھی اسی کوشش میں ہے کہ غیر جانبدار علاقہ وسیع تر ہو جائے۔ بندونگ اسی خواہش کی تکمیل کی ایک صورت تھی۔ ابھی تک نہیں کہا جا سکتا کہ چین اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اب روس بھی مشرق بعید کے محاذ پر آ گیا ہے چنانچہ اس نے جاپان سے مذاکرات شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ مذاکرات یکم جون کو شروع ہوں گے۔ ان مذاکرات میں روس جاپان کو کافی لالچ دے سکتا ہے۔ جاپان کی تجارت چین اور روس سے بالکل بند پڑی ہے۔ حالانکہ اس کے مال کے نکاس کے یہ عمدہ راستے ہیں۔ بے شمار جاپانی قیدی ابھی تک روس کے قبضہ میں ہیں۔ اس کے بعض جزائر بھی روس کے تصرف میں ہیں ظاہر ہے کہ روس ان تمام امور سے متعلق کافی مراعات دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ جاپان کو امریکہ سے کاٹ کر علیحدہ کر دے اور اسے غیر جانبدار بنا لے۔ امریکہ اس صورت حال کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ لیکن اب جو دونوں ممالک کے مذاکرات باہمی کی طرح پڑ گئی ہے، تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا

مغربی ویٹ نام میں حالات ابھی تک معمول پر نہیں آئے وزیر اعظم ڈیم نے علانیہ تو نہیں کہا لیکن وہ در پردہ شاہ باؤدائی کو ملک سے بے دخل کرانے میں مصروف ہیں۔ ان کے حامی ری پبلک کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو امریکہ کے مقابلہ میں فرانس کو بھاری شکست ہوگی کیونکہ فرانس باؤدائی کو اپنے مفاد کے حق میں سمجھتا ہے۔ اس ملک میں جو شورش اور بدامنی پائی جاتی ہے اس کا وقتی فائدہ امریکہ کو

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ھیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قران کی رو سے اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔ رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قران اس باب میں کیا کہتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھ روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے

دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں - جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں قسم اول از خود بھیجدی جائیگی - اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں یا قسم دوم لینا چاہیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM